عشاق کے قافلے

11

میر یوسف عزیز مگسی

(1935-1908)

شاہ محمد مری

جملہ حقوق بحقِ سنگت اکیڈمی محفوظ ہیں

یوسف عزیز مگسی

شاہ محمد مری

پہلا ایڈیشن: 2009
دوسرا ایڈیشن: 2014
تیسرا ایڈیشن: 2017
چوتھا ایڈیشن: 2020
قیمت: 500روپے

پبلشر:
سنگت اکیڈمی آف سائنسز
ڈاکٹر شیر محمد روڈ، مری لیب، کوئٹہ
فون نمبر03003829300

اُس فکر کے نام

جو ''بے'' زمین کسان کو
''سرزمین'' کے لیے جان نچھاور
کرنے پہ تیار رکھتا ہے!

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علَم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

فہرست

2020 کے ایڈیشن کا پیش لفظ

2009 کے ایڈیشن کا پیش لفظ

پہلا چیپٹر بلوچستان اور مگسی قبیلہ

1۔ یوسف کے زمانے کا بلوچستان

2۔ مگسی قبیلہ

دوسرا چیپٹر بچپن، لڑکپن، اور جوانی

1۔ یوسف کا خانوادہ

2۔ لڑکپن، تعلیم

3۔ باپ کا تختہ الٹ جاتا ہے

4۔ ملتان اور یوسف

5۔ محبت، منگنی اور شادی

6۔ گل محمد سردار بنا

تیسرا چیپٹر بلوچ تو ہوتا ہی سیاسی ہے

1۔ ساون کی بھڑکائی آگ

2۔ مرتہ محمود خان۔۔۔!!

3۔ فریادِ بلوچستان

4۔ جیل، اور اس کے اثرات

5۔ خیر الناس من ینفع الناس

6۔ انجمن اتحاد بلوچستان

7۔ ریاست کلات کے مظالم

8۔ مگسی ایجی ٹیشن

9۔ آل انڈیا بلوچ کانفرنس

10۔ یوسف سردار بنتا ہے

11۔ کوئٹہ میں رہائش

12۔ انقلابی اصلاحات

13۔ شاندار ترین خراجِ عقیدت

14۔ حیدر آباد کنونشن

چوتھا چیپٹر یوسف مگسی کا متبادل نظام

1۔ اسلام

2۔ نیشنلزم

3۔ سامراج دشمنی

4۔ فیوڈلزم کا مخالف

5۔ سوشلزم

پانچواں چیپٹر — قلم ہتھیار

الف: صحافت

1- البلوچ

2-بلوچستانِ جدید

3- ینگ بلوچستان

4- نجات

5- الحنیف

6- ہفت روزہ " بلوچستان"

ب: افسانہ

پ: شاعری

ت: خطوط نویسی

چھٹا چیپٹر — شخصیت

1۔ 1۔ شفیق ونرم دل آدمی

2۔ القابات گریزی

3۔ مذہبی آدمی

4۔ عاجزی انکساری

5۔ سچا دوست

6۔ ان تھک ورکر، بے طمع لیڈر

7۔ دولت فتنہ ہے

8۔ جمہوری آدمی

9۔ لوگوں کی بے اعتباری پہ

10۔ میرٹ

11۔ مایوسی موت ہے

12۔ جسم وصورت

ساتواں چیپٹر — لندن جلاوطن

1۔ سرداری سے برطرفی

2۔ یوسف کی پُراسرار بیماری

3۔ وطن پرست، وطن بدر

4۔ پیچھے وطن کا حال

5۔ لندن سرگرمیاں

آٹھواں چیپٹر — لندن سے واپسی

نواں چیپٹر — زلزلہ، زلزالہا

دسواں چیپٹر — برمزارِ ماغریباں......

آخری چیپٹر — عطاشاد

ضمیمہ نمبر 1 — خراج ہائے عقیدت

ضمیمہ نمبر 2 — افسانہ: تکمیلِ انسانیت

2020 کے ایڈیشن کا پیش لفظ

یوسف کے فکر کی بستی اُس کے اپنے آبائی علاقے میں عرصہ ہوا اجڑ گئی۔ اس کے طبعی وارثوں نے شعوری، اور غیر شعوری دونوں طور پر بہت اہتمام کے ساتھ اُس کا نام فراموش ہونے دیا۔ ایسا ہونا بھی چاہیے تھا، اس لیے کہ اس کے نام کے ساتھ ایک نظریہ جڑا ہوا ہے۔ ایسا نظریہ جو بڑی زمینداریوں کو صفر سے ضرب دینے میں دیر نہیں لگاتا۔ اُس نظریے میں خونخوار نظر آنے والے باڈی گارڈوں کی گنجائش نہیں رہتی۔ وہاں وزارتیں اور مشارتیں، حقارتیں تصور ہوتی ہیں۔ بڑی بڑی گاڑیاں، بڑے بڑے بنگلے شرمندگی تصور ہوتے ہیں۔ یوسف کے فلسفہ میں سردار سائیں، نواب سائیں، میر سائیں، اور پیر سائیں سب کی جگہ ''ادا سائیں'' لے لیتا ہے۔ جہاں انسانوں کو شخصی جیل میں ڈالنا، انھیں تھپڑ مارنا یا گالی دینا بہت بڑا جرم تصور ہوتا ہے..... مگسی صاحب کا یہ زریں نظریہ کب کا ''جَھل'' سے پرواز کر چکا ہے۔

مگر، نظریات کی اپنی دوستیاں دشمنیاں ہوتی ہیں: مقامی، صوبائی، ملکی اور بین الاقوامی سطح کی۔ اگر یوسف مگسی کے نظریات کے دشمن گھر میں، اپنے گاؤں میں، اپنے صوبے، اپنے ملک اور

دنیا بھر میں موجود ہیں تو اس کے دوست بھی بالکل اِنھی جگہوں پہ پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اگر ایک طرف اُس چراغ کو بجھانے کی ہوا دینے کی مشینیں چل رہی ہیں تو اسے زندہ رکھنے بھی ہزاروں ہاتھ چراغ اور ہوا کے درمیان سینہ سپر موجود ہیں۔..... یوسف عزیز کا نام مرنے نہیں دیا گیا، اُسے مرنے نہیں دیا جائے گا۔

ساتھ ہی ساتھ اُس کے بارے میں موجود عمومی بے خبری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ قوتوں نے اس کا نام اپنے مقاصد کے لیے بھی استعمال کرنا چاہا۔ کم معلومات' دیوتا سازی کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتی ہیں۔ ہم نے اس کی زندگی، فکر اور جدوجہد کے بارے میں کتابی صورت میں مفصل معلومات دے کر اُسے دیوتا بنانے والوں کی راہ روک دی۔ اب اگر وہ اپنے مذموم مقاصد کے لیے ایک نئے طرز سے اس کا نام استعمال کرنے کا سوچیں گے تو یقیناً کوئی نیا قلم کار اُن کی یہ راہ بھی روک دے گا..... بدی اور نیکی کی جنگ وقتی نہیں ہوتی۔ نیکی اور بدی کی جنگ مقامی نہیں ہوتی۔

پانچ برس قبل والے پچھلے ایڈیشن نے بہت سارا کام دیا۔ کچھ لوگوں نے مگسی صاحب کے دن منائے، کچھ سمینار ہوئے، ایک آدھ پمفلٹ چھپے، کچھ مضامین اخبارات ورسائل میں نمودار ہوئے .....ایک غیر نظریاتی ماحول میں کسی نظریاتی شخص کا محض تذکرہ ہی سیاست کے اندر نظریات کا دخل لازمی بنالیتا ہے۔

کتاب بہت عرصہ ہوا نایاب ہو چکی تھی۔ اُسے مارکیٹ میں موجود ہونا چاہیے۔ ساتھ میں کچھ تبدیلیاں کرنا بھی ضروری ہوگئی تھیں۔ چنانچہ پہلا ایڈیشن چھپنے کے بعد ایک بڑی تبدیلی یہ کی گئی کہ اس کتاب میں سے علامہ اقبال کو نکال کر اُس پہ ایک الگ کتاب بنادی گئی۔ اس کے باوجود کہ ہمارے کارواں کے اکابرین اُس سے بہت متاثر تھے، اقبال اِس کارواں کا راہی نہ تھا۔ اس کے علاوہ اقبال اس قدر متنوع اور اتنا بڑا شاعر ہے کہ اس کا کسی اور مجمع میں ٹھسا ہونا نامناسب بھی ہے۔ لہٰذا میں نے اپنی منکسر تنقیدوں، تبریکوں، اور تردیدوں تکریموں کے ساتھ اُس پر ایک الگ کتاب لکھ دی ہے۔

دوسری تبدیلی یہ ہوئی کہ کتاب کے متن میں بہت کچھ اضافے کیے۔

ہمیں حالیہ برسوں میں بلوچستان جدید کراچی، ینگ بلوچستان، اور نجات کراچی جیسے اخبارات کے مکمل فائل دستیاب ہوئے۔ اور پھر بلوچ تاریخ کے اُس سنہری دور کا ترجمان ''البلوچ'' کراچی، ملا۔ اس کے علاوہ روزنامہ زمیندار لاہور، اور انقلاب لاہور کے بہت سارے متعلقہ شمارے بھی ہماری دسترس میں آئے۔ گویا ایک خزانہ ملا۔ ہم مالا مال ہوئے۔ اس لیے ہم اُن کی ایک ایک سرگرمی کی رپورٹ دیکھ، اور چھان سکے ہیں۔

اسی طرح مگسی صاحب کا خودنوشت سوانحی طویل افسانہ ''تکمیلِ انسانیت'' بھی اِسی دوران ہمیں ملا۔ یوسف کے متعلق عبدالعزیز کرد، محمد امین کھوسہ اور عبدالصمد اچکزئی کی تحریریں دستیاب ہوئیں اور خود مگسی صاحب کی مزید شاعری اور مزید خطوط حاصل ہوگئے۔

ہم اس کے حصولِ تعلیم کے سلسلے میں بہت ناقص معلومات رکھتے تھے۔ ہم نے پچھلے ایڈیشنوں میں اُس کے والد کی بڑی تعریف کی تھی کہ گویا اس نے یوسف کی تعلیم کے لیے بہت کچھ کیا تھا۔ مگر اب اُس کی اپنی تصانیف ملیں تو عقدہ کھلا کہ ایسا نہ تھا۔ باپ نے اسے فارمل ایجوکیشن تو دی ہی نہیں تھی جس کا زندگی بھر اُسے قلق رہا۔

پھر اب تک ہمیں اُس کی شکل وصورت کے بارے میں معلومات نہ تھیں۔ یہ بات ہمیں اس کی اپنی خودنوشت سوانح حیات میں ملی۔ اُس کے تحت وہ شباب کی رعنائیوں کا مجسمہ تھا۔ اس کا قد لمبا تھا، آنکھیں نرگسی، گردن بلوریں اور غزالی تھی۔

میں اپنی اِس حیرت کو یہاں دہراتا ہوں کہ یسوع، چے گویرا، اور کرسٹوفر کاڈویل کی طرح کے لوگ دنیا کو ہلا ڈالتے رہے جن کو قدرت نے زیادہ زندگی نہ دی تھی۔ یوسف علی مگسی کی ٹوٹل زندگی 27 سال کی رہی۔ وہ 1908 میں پیدا ہوا اور 1935 میں فوت ہوا۔ ان مختصر 27 برسوں میں چودہ پندرہ سال تو بچپن لڑکپن اور جلاوطنی میں گئے۔ بقیہ دس برس!!۔ جیل ونظر بندی وجلاوطنی نکالو تو سرگرم سیاسی زندگی کے چھ سال بچتے ہیں۔ صرف چھ سال!

اگست 1928 سے اُس کا سرگرم خط وکتابت کا کام شروع ہوتا ہے اور یہ سلسلہ اُس کی

موت (مئی 1935) تک چلتا ہے اور یہی چھ سات سال بلوچ دنیا کو جھنجوڑ ڈالنے والے سال بنے۔ صلاحیتوں سے لبالب یہ انسان انھیں استعمال کرنے پاگلوں کی طرح تھرکتا بھاگتا رہا۔ اس قدر صلاحیتیں کہ جنونی بنے بغیر زندہ نہ رہا جاسکے! (جابجا وہ اِس جنون کا، بے چینی کا، اور مزید کچھ کرتے رہنے کی تڑپ کا اظہار کرتا ہے)۔

بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ یوسف عزیز مگسی عام آدمی نہ تھا۔ وہ ہماری تحریک کا سپارٹیکس تھا۔ یوسف بلوچستان کا وہ فرزند تھا جس نے ریاستِ قلات کے بے پناہ مظالم کے خلاف آواز بلند کی۔ اور پاداش میں اُسے ایک سال قید اور دس ہزار روپے جرمانے کی سنگین اور صبر آزما سزا بھگتنی پڑی تھی۔ اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے بعد اُس نے ہندوستان کو گوشے گوشے تک بلوچستان کی بدنصیبی اور مظلومیت کی داستانیں پہنچانے کا پرعزم کام کیا۔ اور صرف اسی پر ہی بس نہ کی بلکہ ہزاروں روپے صرف کر کے، اور راتوں کی نیند، دن کا چین تج کر بلوچستان اینڈ آل بلوچ کانفرنس نامی سیاسی پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ جس میں بلوچستان کے حقیقی خیر خواہوں نے شریک ہوکر اپنے عزیز وطن کی آئندہ بہتری کے لیے ایک مناسب لائحہ عمل مرتب کیا۔

اِس ہر دل عزیز حکمران اور محبوب سردار کے حسنِ تدبر، انتظامی قابلیت اور خداداد فہم و فراست سے اُس کا وسیع علاقہ اعلیٰ طریق پر نظم ونسق ہو رہا تھا۔ رعایا اس سے بہت خوش تھی۔ علاقہ میں نہایت پرسکون اور پُر امن فضا قائم ہوئی۔ بہبود خلائق کے سلسلے میں اس نے مدارس کھولے۔

میر یوسف علی خان بلوچوں کے ہزاروں برسوں کی تاریخ میں اس لیے نمایاں اور ممتاز ہے کہ اس نے اپنے عمل، مطالعہ اور مشاہدہ سے سیاسی شعور حاصل کیا۔ اور سیاسی و جمہوری طور پر جدوجہد کی اور کامیابی پر تعمیری وترقیاتی کام کرتے ہوئے اپنے عوام کی خدمت کی۔

بلوچستان گذشتہ ایک صدی سے عزیز مگسی کے فلسفے کے نیوکلیئس کے گرد گھوم رہا ہے۔

سیاستدان بھی، اکیڈمیشنز بھی، نظریہ دان بھی، مؤرخ بھی اور عوام الناس بھی۔

یوسف مگسی کی تاریخی حیثیت کو اُس کی فکر کی شان کے مطابق آگے بڑھنا ہے۔ اور یوسف کے اعمالِ حسنہ اب مزید نظروں سے اوجھل نہ ہو پائیں گے۔ بلوچوں کی غریب مگر عظیم اکثریت فیوڈلوں کے سرابِ نظر فریب سے بچ پانے کی جدوجہد اور کامیابی میں یوسفی زندگی سے بہت کچھ سیکھیں گے۔

یوسف نے جن کے خلاف 'شمس گردی' لکھی تھی، اُن کا قبیلہ آج بھی زندہ بھی ہے، اور حکمران بھی ہے۔ سو سال گزر گئے، کئی لوگ مچ جیل ہوئے، کئی کلی کیمپ ہوئے اور کئی تاریک راہوں میں مارے گئے۔ مگر حکمران طبقہ ابھی تک سلامت و موجوں میں ہے۔

میں نے یہ کتاب صرف یہ بتانے کے لیے لکھی ہے کہ یوسفی ٹولی بھی سلامت ہے، اور یہ بھی یقین بھی رکھتی ہے کہ جیت اُسی کی ہوگی۔

شاہ محمد مری

29 جنوری 2021

ماوند

2009 کے ایڈیشن کا پیش لفظ

یہ کتاب بلوچستان کے اُن آزادی پسند انسانوں میں سے ایک کے بارے میں ہے، جنھیں پوری بلوچ تاریخ میں پہلی بار شہری سیاست کا مورچہ نصیب ہوا تھا۔ اُس سے پہلے بیرونی حملہ آوروں کا مقابلہ مسلح جنگ سے ہی ہوتا رہا جو بذاتِ خود بلوچ تاریخ کا ایک سنہرا حصہ ہے۔ مگر یوسف عزیز مگسی اور اُس کے رفقا لیڈروں کی وہ پہلی کھیپ ہے جنھیں تاریخ نے یہ موقع دیا کہ اپنی جدجہدِ آزادی میں شہری طرز کا پلہ بھاری رکھ سکیں۔ اُن سے قبل آزادی کی تحریک کو شہری مراکز میسر ہی نہ تھے۔ نہ شہری طبقہ وجود میں آچکا تھا۔ اور یوں ہماری اب تک کی ساری آزادی کی تحریک مسلح رہی تھی۔ چنانچہ بلوچ تحریک میں شہری مراکز والی سیاست ایک بالکل نئی بات تھی، جس میں اخبار، پمفلٹ، سیمینار، جلسہ، جلوس، تنظیم، اور تنظیمی انتخابات شامل تھے۔

اس بالکل نئے مورچے کے ظہور کا مطلب ہی یہ تھا کہ بلوچستان میں ایک آدھ شہری (سوِک) سنٹرز قائم ہو چکے تھے۔ اور ایک پڑھا لکھا طبقہ وجود میں آچکا تھا جس کی جڑیں شہری مرکز میں پیوست تھیں۔

اِس نئے مورچے کا دوسرا مطلب یہ بھی تھا کہ لیڈروں کی ایک ایسی کھیپ بھی وجود میں آ چکی تھی جو انگریزی تعلیمی اداروں سے نکلی تھی، جنھیں آئینی حکمرانی کا ادراک تھا۔ اور وہ ہم عصر انڈین نیشنلسٹوں کے طرزِ سیاست سے آشنا تھے۔

لہٰذا ایک ایسی انگریز دشمن تحریکِ آزادی وجود میں آئی جو اپنے جوہر میں فیوڈل مخالف جمہوری تھی، اور فارم میں ایک جمہوری تنظیم پر مشتمل منظّم سیاست کرتی تھی۔

میر یوسف عزیز کا عہد سوویت انقلاب کا عہد بھی تھا۔ جس کی وجہ سے دنیا جہاں کا انقلابی ادب اِس خطے کے قارئین کے ہاتھوں پہنچ رہا تھا۔ اسے پڑھ کر اِن سارے احباب کو تین فائدے حاصل ہوئے: ایک تو انھیں یہ معلوم ہو رہا تھا کہ بیسویں صدی میں سامراج سے آزادی کی جدوجہد سوشلزم کے لیے جدوجہد سے نتھی ہوتی ہے۔ دوسرا انھیں یہ ادراک بخشا کہ دنیا کے لوگ کس طرح اپنی اپنی راہوں اور اپنی اپنی جدوجہد سے سوشلزم کی طرف رواں دواں ہیں۔ تیسرا فائدہ یہ ہوا کہ انھیں یہ جانکاری ملی کہ انقلاب کے بارے میں اس جہانِ رنگ و بو کے دیگر ممالک کے مجاہدوں اور مفکروں، فلاسفروں اور مدبروں نے کیا کیا خدمات سرانجام دی ہیں۔

انگریز کے خلاف تحریکِ آزادی کے شہری شعبے کی قیادت بلا شبہ محمد یوسف علی خان عزیز مگسی نے کی۔

یوسف عزیز مگسی بلا لحاظِ قوم و مذہب، مظلوموں کی طرف داری کرنے والا ہم سب کا نظریاتی و سیاسی راہنما ہے۔ میں نے مقابلے کی بہت کوشش کی، بہت سر کھپایا، قلم گھسیٹا مگر جو خطاب اُسے خان عبدالصمد خان نے دیا تھا، اُس سے بڑا خطاب میں تلاش اور وضع نہ کر سکا: ''مادرِ وطن کا بہترین فرزند''۔

یوسف اور اس کے کامریڈز ایسے سوشل ورکر بھی تھے جو انسانوں کے لیے ایک بہتر، اور ایک پُر امن زندگی کا قیام چاہتے تھے۔ ان میں سے تقریباً ہر ایک اپنی زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں سوشلسٹ بن گیا تھا یا سوشلزم سے تعلق میں آ گیا تھا۔ یہ پڑھے لکھے لوگ کسی نہ کسی حد تک

اقبال، ظفر علی خان اور محمد علی جوہر کے ہم عصر تھے۔ چنانچہ ان سب لوگوں کی تحریر اور تکلم میں اچھی خاصی یگانگت دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ لوگ ایک دوسرے سے اثر بھی لیتے رہے، ایک دوسرے کو متاثر بھی کرتے رہے۔

مولانا ظفر علی خان ہی نے تو یوسف علی خان کے بارے میں کہا تھا:

تم کو خفی عزیز ہے، ہم کو جلی عزیز
عارض کا گل تمھیں ہمیں دل کی کلی عزیز
لفظِ بلوچ مہر و وفا کا کلام ہے
معنی ہیں اس کلام کے یوسف علی عزیز

ویسے تو بلوچستان میں اِس سیاست کا بانی عبدالعزیز کرد تھا۔ اور اُس کی یہ حیثیت کبھی کم بھی نہیں کی جا سکے گی۔ مگر مخصوص بلوچ معاشرے کے پس منظر میں، نیز اپنی مخصوص چھلاوے جیسی خصلت کی بنا پر اِس تحریک کا بابا، نواب یوسف علی خان عزیز مگسی بنا۔ مقدر نے بہت کم عرصے میں اُس سے زقندیں بھروا کر اتقائی منازل طے کروائیں۔ پہلی بار اُسی نے ہی سرداری دستار کو عوامیت کے کپڑے پہنائے۔ اور نچلے طبقات کی حکمرانی قائم کی۔ اس طرح وہ نہ صرف جدوجہدِ آزادی کا لڑاکا سپاہی رہا بلکہ طبقاتی جدوجہد بھی کرتا رہا۔ اور اس کے بعد بلوچوں کے کم رقبے میں ہی سہی، مزدوروں کسانوں کی اولین حکومت بھی قائم کی۔ (یہ آخری کام دانش وروں کی توجہ نہ پا سکا)۔

اُس وقت سے لے کر آج اکیسویں صدی کے اوائل تک بلوچ سیاست انھی دو جدا جدا میدانوں میں جاری ہے: مسلح تحریک اور شہری تحریک۔ اِن دونوں کے بیچ کبھی بہت ہی گہرے رفیقانہ تعلقات رہے ہیں، کبھی ایک دوسرے میں بدل جانے والے، کبھی باہم پر امن بقائے باہم والے اور کبھی کبھی بالکل ہی معاندانہ و متصادم۔ مسلح بازو کا تذکرہ ہم اپنی دوسری تصنیفات میں کر چکے ہیں۔ اِس جلد میں ہم اپنے اُن اکابرین کا ذکر کر رہے ہیں جو ہماری تحریکِ آزادی کے شہری حصے کے بانیوں میں سے تھے۔ اور جن کے نظریہ اور جدوجہد کی تاریخ جانے بغیر بلوچ قومی عوامی تحریک کے دونوں شعبوں میں سے کسی کو بھی نہیں جانا جا سکتا، نہیں سمجھا جا سکتا۔

میر یوسف عزیز مگسی نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ صحرائے بلوچستان میں وہ پودا لگایا، جس نے پھیل کر پورا نخلستان بننا تھا۔ ایسا نخلستان جس نے نہ صرف انسانی بہبود کے قافلوں کے ستانے کو گھنا اور ٹھنڈا سایہ مہیا کرنا تھا بلکہ ایسے قافلوں کی سمت کے تعین اور درستگی کا کام بھی دینا تھا۔

یہ ستاروں کا ایک جھرمٹ تھا جو اِس وطن کے آسمانوں پہ درخشاں تھا۔ یہ لوگ بلاشبہ ہماری آج کی سیاست کے پیچھے تاریخ کے عظیم سنگ ہائے میل بنے کھڑے ہیں۔ ہم صرف ان کا نام لیتے رہیں بھی تو کبھی نہ بھٹک پائیں۔ ان ساتھیوں میں کون سا ایسا ہے جس کی وجہ سے آج ہماری پیشانی پہ ندامت کا کوئی داغ ہو؟ ۔ یہ تو دکھوں، تکالیف اور تعزیروں زندانوں کے باشندے تھے۔

ہم بدقسمت ہیں کہ ان بڑے انسانوں کو بھول گئے ہیں ۔ ایک ایک شخص کی قربانیاں راستے کا مشعل ہیں، ایک ایک انسان کی جیل کی طوالت کا تذکرہ ہی ہمیں ہر طرح کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے سے بچائے گا: عبدالصمد اچکزئی 28 برس، محمد حسین عنقا 20 برس، میر غوث بخش بزنجو 25 برس۔۔۔اور خود یوسف مگسی اپنی 27 سالہ کل زندگی میں ایک سال نظر بند، چار ماہ جیل۔

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو نیک لوگوں کا تذکرہ کرتے اور سنتے ہیں ۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ اُن لوگوں کو یاد کر رہے ہیں جو دکھوں اور قربانیوں کی تھالی میں کھاتے تھے۔ وہ لوگ خوش قسمت ہیں جو اتنے باہم قریبی اصحاب کی الگ الگ خانقاہیں بنا کر اپنی روٹی روزی حرام کرنے والوں میں شامل نہیں ہیں۔

اپنے اچھے لوگوں کو یاد کر کے ذوق بہتر ہو جاتا ہے، انسانیت والے ذائقہ کی سطح بلند ہو جاتی ہے۔ ہم جو مار دھاڑ دیکھنے سننے کے عادی ہو چکے ہیں، ہم جو ہیروئن کے سمگلر کو مثالی انسان بنا کر ہیرو پرستی میں پھینک دیے گئے ہیں، ہم جو باڈی گارڈ برداروں کو لیڈر دیکھتے آئے ہیں۔ ہم بہتر انسان بن جائیں گے۔

اپنے ایمان کی سلامتی کے لیے اِن غیر معمولی انسانوں کو یاد کرتے رہنا چاہیے۔

شاہ محمد مری

ماوند

29 جنوری 2009

عـزیـزی عـزیـزی زبــس اے عزیز
کـه درسیـنهِ خویش داری سه چیز
اول شـعـریــت کــه پسـنـدم زحـد
دوئـم مـن بـلـوچـم بـلـوچی تو نیـز
سـوئـم درد قـومـی که گردم فداش
مـکـن بـــس زعـنـقـا زیـاده گـریـز

عنقا

بلوچستان اور مگسی قبیلہ

1۔ یوسف کے زمانے کا بلوچستان

انگریز سے قبل جب بلوچستان ایک تھا تو اُس پر خان کا آئین چلتا تھا۔ اِس کا آئینی وسیاسی ڈھانچہ وفاقی اور بہت ہی کھلی ڈلی کنفیڈریسی کے اصولوں پر قائم تھا۔تمام قبائلی علاقے اپنے اپنے سردار کے تحت اپنی اپنی قبائلی رسوم کے تحت چلتے تھے۔انگریز کے منحوس دخل سے قبل سب سے خوبصورت بات یہ تھی کہ سردار کا ادارہ بہت کم فاشسٹ اور بہت کم موروثی تھا۔ اِس قرآن زدہ سامراج کے آنے کے بعد نہ صرف سردار کا ادارہ حتمی طور پر موروثی ہوگیا بلکہ انعام، تنخواہ اور جاگیریں دے دے کر اُس ادارے کو مستحکم، مستقل، مطلق العنان اور مقتدرہ بھی بنا دیا گیا۔

بعد میں یوسف عزیز مگسی کے زمانے تک آتے آتے بلوچستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ایران، افغانستان، سندھ اور پنجاب میں شامل کر دیا گیا تھا۔ بقیہ جو ٹکڑا بچا تھا اس کو قبائلی ایجنسیوں، ریاستِ کلات اور برٹش بلوچستان نامی تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ برٹش بلوچستان پہ تو وہ ڈائریکٹ حکمرانی کرتا تھا۔ باقی حصوں پہ بھی حکمرانی تو انگریز کی تھی۔ البتہ داخلی اختیار وحقوق خان اور سرداروں کو حاصل تھے۔مگسی کے زمانے میں دوسرا بلوچستان ''ریاستی بلوچستان'' کہلواتا تھا۔جس

میں مکران وخاران ولسبیلہ وقلات کی ریاستیں شامل تھیں۔

2۔ مگسی قبیلہ

نسبتاً ایک مضبوط تھیوری یہ ہے کہ مگسی قبیلے کا نام مغربی (ایرانی) بلوچستان کے مگس نامی علاقے کے نام سے متعلق ہے۔

جن بلوچوں کو لاشاری کہا جاتا ہے یا گوئہرام کی اولاد سمجھا جاتا ہے، ان میں مگسی قبیلہ سب سے نمایاں ہے۔ گوئہرام کی اولاد والی بات شاید درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ گوئہرام اپنے وقت کے ہزاروں لاشاریوں کا سردار تھا، نہ کہ باپ۔ اسی طرح چاکر ہزاروں رندوں کا سردار تھا، باپ نہیں۔ بہرحال، بہت سے قبائل کے برعکس مگسیوں کا ذکر کلاسیکل بلوچی شاعری میں ملتا ہے۔

مگسی قبائل بالخصوص کھجور، اناج اور صنعتی فصل یعنی کپاس کی کاشتکاری کرتے ہیں۔ یہ لوگ گنداواہ اور جھل کے علاقے کے باشندے ہیں جہاں ان کے فیوڈل (سردار) رہتے ہیں۔مگر یہ قبیلہ سندھ میں بھی ایک بڑے قبیلے کے بطور موجود ہے۔ اسی طرح میں نے اندورنِ پنجاب میں بے شمار مگسی آبادیاں دیکھی ہیں۔ایرانی بلوچستان میں بھی مگسی آباد ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مشرقی قبائل میں صرف مگسی اور ڈومبکی دو قبائل ایسے ہیں جنھوں نے خانِ قلات کی اطاعت قبول کر لی۔ اور اُن کی تاریخ، خوانینِ قلات کی تاریخ کے ساتھ چلتی ہے۔ خان کے دربار میں مگسی قبیلے کا شمار جھالاوان کے قبائل میں ہوتا تھا۔ جہاں خان کے بعد مگسی قبیلہ، سرِ سردارانِ جھالاوان کی بڑائی مانتا تھا۔

ہر بڑے بلوچ قبیلے کی طرح مگسی بھی ایک جغرافیائی نیم خودمختار قبیلہ تھا۔ اُس کا ہیڈکوارٹر، جَھل ایک طرح سے خود ایک ریاست تھی۔ اس کا اپنا عدالتی نظام تھا، اپنا تعلیمی نظام، جیل، جرگہ اور یادگاری ٹکٹ موجود تھا۔مگر جیسا کہ ہم کہہ چکے یہ جھالاوان کے چیف (زرکزئی) کی بڑائی میں قلات سٹیٹ کا حصہ تھا۔

قبیلہ مگسی کے ذیلی فرقوں کے بارے میں میں نے اِدھر اُدھر بہت پڑھا، سنا۔ مگر مجھے تفصیلی اور نسبتاً زیادہ معتبر بات مرید حسین مگسی کی لگی۔ مرید حسین مگسی نے اپنی کتاب ''تاریخِ مگسی قبائل'' میں مگسی قبیلے کی مفصل تاریخ دی ہے۔

اُس نے دلچسپ انداز میں مگسی قبائلی کی ذیلی شاخوں (ٹکر) کو پہلا ٹکر، دوسرا ٹکر، تیسرا۔۔۔ میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا ٹکر: وہ پہلے ٹکر کو ''ٹٹانڑیں'' کا نام دیتا ہے۔ جس میں بھوتانڑیں، روتانڑیں، مرزانڑیں اور نندانڑیں نامی ذیلی شاخیں شامل ہیں۔ وہ اس ٹکر میں کھوسہ قبیلہ کی بلیلانڑیں (اس کی ذیلی شاخیں عرضیانڑیں، فدانڑیں، گھمڑانڑیں، میوانڑیں، حدوانڑیں، فریدانڑیں، جیٹھانڑیں، مالوانڑیں، پلیانڑیں، بہرانڑیں، درخانی، بڈانڑیں، دلاوانڑیں، مالمانڑیں، بھاریانڑیں) کو بھی شامل کرتا ہے۔

دوسرا ٹکر: مرید حسین دوسرا ٹکر شمبانڑیں کو قرار دیتا ہے۔ اُس کی دس ذیلی شاخیں سارگانڑیں، بنگلانڑیں، مغلانڑیں، لاسکانڑیں، گنسر، وسدانڑیں، حالوخانی اور صفرانڑیں ہیں۔

وہ پھر سارگانڑیں کی مزید چھ شاخوں کا تذکرہ کرتا ہے: مزارانڑیں، بشکیانڑیں، چاکرانڑیں، واحدیانڑیں، گہنانڑیں اور کیچوانڑیں۔

اسی طرح وہ بنگلانڑیں کے دو ذیلی گروہوں کا نام لیتا ہے: مندوانڑیں اور جانیگانڑیں۔

اس نے مغلانڑیں کو دو حصوں میں بیان کیا ہے۔ ایک حصہ کے گروہ ہیں؛ جمالازئی، بگرانڑیں، گولانڑیں، گاجانڑیں، حاجانڑیں اور گاہانڑیں۔

دوسرا حصہ بھی چھ گروہوں پر مشتمل ہے: شیرانڑیں یا شاہل زئی، کمبرانڑیں، ٹھاروانڑیں، موسیانڑیں، ڈاھیانڑیں اور حمدانڑیں۔

تیسرا ٹکر: مرید حسین تیسرا ٹکر عیسبانڑیں (ہسبانڑیں) کو قرار دیتا ہے۔ بیڑاکانڑیں میں انگلانڑیں، ساہوزئی، سارگانڑیں اور دوستدانڑیں نامی ذیلی شاخیں ہیں۔ سیاہانڑیں میں بیرانی، کلانی، جمالانڑیں، جوگانڑیں اور میڑانڑیں شاخیں ہیں۔ اس ٹکر میں تیسرا شاخ لوئی ہے جس کی ذیلی شاخیں بڈھانڑیں، ممدانڑیں، ہڈیانڑیں، کیجانڑیں اور وھدانڑیں ہیں۔ عیسبانڑیں کی چوتھی شاخ

بجرانڑیں ہے۔

چوتھا ٹکر: مگسی کا چوتھا ٹکر ساکھانڑیں ہے۔ اس کی شاخیں ہیں: باؤٹھانڑیں، ننگرانڑیں، جامانڑیں، باگڑانڑیں، سایانڑیں، مندوستانڑیں اور لگڑانڑیں۔

پانچواں ٹکر: پانچواں ٹکر ہے: کاتی۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے حمدانڑیں میں زیرکانڑیں، خیرانڑیں، بالوانڑیں اور حلوانڑیں نامی ذیلی شاخیں آتی ہیں۔ دوسرا حصہ آدمانڑیں ہے اور اس کی ذیلی شاخیں ہیں: لونگانڑیں، حنانڑیں، احمدانڑیں، جودہانڑیں اور آریانڑیں۔

چھٹا ٹکر: حسرانڑیں اور راہیجہ میں منقسم ہے۔ حسرانڑیں کی ذیلی شاخیں جانی گانڑیں، پیرکانڑیں، محبتانڑیں، پلیانڑیں، میہانڑیں، جنیدانڑیں اور نوثانڑیں ہیں۔

راہیجہ مالہینی، سنجرانی، ممدانی اور جودہانی میں تقسیم ہوتا ہے۔(1)

بھوتانڑیں، مگسیوں کو سردار سپلائی کرنے والا طائفہ ہے۔ ان کے پاس بے شمار زرعی زمین ہے۔ (دلچسپ ہے کہ لسبیلہ میں بھوتانڑیں ایک الگ قبیلے کی صورت رہتے ہیں)۔

ریفرنسز

1- مرید حسین، خان۔ تاریخِ مگسی قبائل (سالِ طبع اور پبلشر نہ دارد)۔ صفحہ 49

دوسرا چیپٹر

بچپن، لڑکپن، اور جوانی

1۔ یوسف کا خانوادہ

سردار کیسر خان، سردار احمد کا بیٹا تھا جسے سرداری کے ایک دوسرے دعوے دار نے 1865 میں قتل کر دیا۔ صغیر سِن کیسر خاں کو والد کے ساتھ مرنے سے کلپر ولد التاش جامانڑیں، ایک نامعلوم مری، اور چاندرامہ نامی ایک آدمی نے بچالیا تھا۔

کیسر خان کے دادا کا نام مہیں خان تھا۔ یہ وہی مہیں خان تھا جو خان خداداد خان کے ساتھ اُس فوج میں شامل تھا جو انگریز کے کہنے پر مری قبیلے پر 21 جنوری 1859 میں حملہ آور ہوا تھا۔ پھر یہی مہیں خان اُس فوج میں بھی شامل تھا جس نے 63-1862 میں دوبارہ خان کی سربراہی میں مری پر حملہ کر دیا۔ کہتے ہیں کہ مہی خان / مہیں خان / میاں خان جب خان کو مری قبیلے پر حملہ سے باز نہ رکھ سکا تو اس نے خود کو سواری سے گرا دیا۔ خان نے اُسے براشگون سمجھا اور لشکر کو واپس ہونے کا حکم دیا۔ یہ اچھا آدمی لاڑکانہ میں زمین خرید کر اپنے قبیلے کو وہاں آباد کر چکا تھا۔ 1862 اس کا سالِ وفات ہے۔

کم سن کیسر خان کے جوان ہونے تک اس کی ماں محترمہ دھانی نے راجہ خان مرزانی کو علاقے کا مختیارِ عام مقرر کیے رکھا۔ (1)

کیسر خان مگسیوں کا سولہواں سردار تھا۔ وہ انگریز حکومت کی طرف سے 1903 میں ''نواب'' بنا۔ یہ نواب نہ تو بلوچی لفظ ہے اور نہ بلوچ ٹائٹل۔ نواب اصل میں سپینش زبان کے لفظ ''نباب'' کی بگڑی شکل، ہے جس کا مطلب ہے: عزت مآب۔ بلوچستان میں یہ لفظ اور اس کے گرد اس کا پورا ادارہ انگریز کا لایا ہوا دھبہ ہے۔ انگریز کی طرف سے کیسر خان کمپین ین آف موسٹ ایمینٹ آرڈر آف انڈین ایمپائر (سی آئی ای) بھی تھا۔

اُس زمانے میں اس قبیلے کی تعداد پندرہ ہزار تھی۔ اور یہ نوابی اچھی خاصی دولتمند نوابی سمجھی جاتی تھی۔

کیسر خان کی دو بہنوں کا نام معلوم ہوسکا ہے: جان بی بی اور شاہ بی بی۔

1876 میں نصرت خان مگسی نے اپنی بیٹی کی شادی سردار کیسر خان سے کردی۔ نصرت خان علاقہ چوبارہ ضلع لیہ سے نقل مکانی کردہ مگسی تھا۔ وہ قلات کے فوجی رسالہ میں جمعدار کے عہدہ پر تعینات تھا۔

نصرت خان کی بیٹی کے بطن سے سردار کیسر خان کے ہاں 1883 میں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام گل محمد رکھا گیا۔ یوں گل محمد، کیسر خان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ وہ چوں کہ نواب کا بڑا بیٹا تھا لہٰذا جاں نشین بھی اُسے ہی ہونا تھا۔ چنانچہ وہ ''چھوٹا نواب'' کہلاتا تھا۔

کیسر خان نے ایک اور شادی سردار پسند خان زہری کی بیٹی مائی پُلّاں سے کی۔ یعنی وہ خاتون چیف آف جہلاوان خان محمد، اور نوروز خان کی بہن تھی۔ اس سے 1908 میں یوسف علی خان اور 1913 میں محبوب علی خان پیدا ہوئے۔ یوں جہلاوان کے زرک زئی یوسف کے ماموں ہیں۔

کہتے ہیں کہ وہاں ضلع ایجوکیشن افسر نے بچوں کے یہ نام رکھے تھے: یوسف علی، اور محبوب علی۔

دوسرے الفاظ میں یوسف علی اور محبوب علی، گل محمد کے سوتیلے بھائی تھے۔

اِس قبیلے نے بلوچ قومی عوامی تحریک میں شرف وعزت کا مقام اُس وقت حاصل کیا جب

اس نے یوسف علی خان نامی بیٹے کو جنا۔ وہ شعور پا کر بہت عاجز سیاسی کارکن بن گیا۔ وگرنہ بلاشبہ اُسے بلوچوں میں ''بابائے قوم'' کا مقام حاصل ہے۔ وہ بلوچ کے مستقبل کا قطب نما ہے۔ کئی نسلوں سے لوگ اس کے نظریات کی پیروی کرتے چلے آرہے ہیں۔

ہمیں یوسف عزیز کی عزت مند والدہ کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ بس امین کھوسو کا سات نومبر 1965 کا ایک خط ملا ہے جو اس نے جی ایم سید کو لکھا تھا۔

''یوسف سے میرا یارانہ اس حد تک ہوا کہ اس کی شہادت کوئٹہ کے 1935 والے قیامت خیز زلزلے میں ہوئی۔ اُن کے بعد ان کی والدہ محترمہ مجھے پکارتی ہی یوسف تھی۔ کوئٹہ میں آتی تھی میرا معلوم ہوتا تو یکدم مجھے بُلا لیتی تھی''۔

کہتے ہیں کہ جب بچے بڑے ہوگئے تو یوسف نے مصر کے یوسف کی کہانیاں سن اور پڑھ لیں۔ اور پھر وہاں کے بادشاہ عزیز سے یوسف کے تعلق کے بارے میں معلوم ہوا۔ اور تب سے اُس نے عزیز اپنے نام کے ساتھ شامل کرلیا: یوسف عزیز۔ البتہ اپنے خطوط میں اس نے ایک جگہ اپنا نام ایم یوسف علی عزیز بھی لکھا۔(2)

2۔ لڑکپن، تعلیم

ریسرچرز کو کہیں 2017 میں جا کر اُس کا خودنوشت سوانحی افسانہ ملا۔ مگسی صاحب نے اپنے خودنوشت سوانحی افسانہ ''تکمیل انسانیت'' میں اپنی تعلیم کے بارے میں یوں لکھا:

''جس طرح کہ قدامت پرست رئیسوں کا شیوہ ہے کہ ہر ایک فائدہ بخش اور نفع رساں چیز سے جس کا حصول خاص کر فی زمانہ عزت اور آرام سے رہنے کے لیے ضروری ہے، ہمارے باپ دادوں نے ایسا نہیں کیا۔۔۔ 'ہماری اولاد کو ملازمت تھوڑی کرنی ہے۔ اسلاف کی روایات اور طرزِ معاشرت کے لیے انگریزی تعلیم مضر ہے، خطرناک ہے' وغیرہ وغیرہ کہہ کر اپنی اولاد کی بربادی کا باعث بنتے ہیں۔ اسی طرح عزیز احمد (یوسف) کو باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے سے محروم رکھا گیا۔ البتہ احباب کے مجبور کرنے پر اس کا والد صرف اس حد تک آمادہ ہوا کہ اُس کے لیے ایک اُردو فارسی

کا معلم 80 روپیہ ماہوار مشاہرہ پر رکھا گیا۔''(3)

ڈاکٹر انعام الحق کوثر کے مطابق 1913 میں (یعنی پانچ برس کی عمر میں) اس کا پہلا استاد، قاضی رسول بخش بنا۔ قاضی صاحب نے یوسف کو ابتدائی دینی تعلیم دی۔(4) مگر خالد خٹک نے یہ سال 1915 لکھا جب لاڑکانہ سے جھل واپسی پر نواب کیسر خان نے یہ ٹیوشن رکھوائی تھی ۔(5) یعنی سات برس کی عمر میں۔

یوسف، بعد ازاں مولانا غلام قادر کی تربیت میں رہا(6)۔ اس نے اسے اردو، فارسی اور عربی پڑھائی۔ یوں مگسی صاحب کو عربی، فارسی اور اردو پر مکمل دسترس ہوگئی۔ آپ بعد کے اُس کے خطوط اور دیگر تحریریں پڑھیں تو حیران رہ جائیں گے کہ اُسے ان زبانوں پہ کس قدر عبور حاصل تھا۔ جگہ جگہ آپ کو قرآنی آیات، احادیث اور رومی و حافظ و سعدی کے اشعار ملیں گے۔ اور وہ بھی بے ساختہ، بغیر کسی مصنوعیت کے۔

والد نے انگلش کی تعلیم کے لیے لاہور سے ایک استاد کنہیالال بی اے کو منگوایا تھا جس نے کُل وقتی طور پر مگسی صاحب کی راہنمائی کی اور ڈیڑھ سال کے اندر اندر اسے انگریزی زبان و ادب کی تعلیم دی(7)۔

ہم اُس کی سوانحی کہانی ''تکمیلِ انسانیت'' سے مزید مدد لیتے ہیں: ''۔۔۔رئیس زادے اکثر سیر و شکار کھیل و کود کے دلدادہ ہوتے ہیں، مگر عزیز کو ان باتوں سے نفرت تھی۔ اس کو بچپن سے ہی حصولِ تعلیم کا شوق ہی نہیں بلکہ جنون تھا۔۔۔ چار بجے منہ اندھیرے اٹھ کر نوکر کو ساتھ لیے استاد کے ہاں جانا، اور شام منہ اندھیرے گھر واپس آنا۔ گھر میں بھی کتابیں ساتھ لے آنا۔ کھانا کھانے کے بعد چراغ سامنے رکھ کر پڑھے ہوئے سبق کو پوری طرح حفظ کر لینا۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ اس کی والدہ نے پہلی نیند کے بعد کروٹ لینے پر جو اپنے سعید بیٹے کو یوں مصروفِ کتاب دیکھا تو جذبۂ محبتِ مادری سے مغلوب ہو کر بستر سے اٹھ عزیز کے گالوں پر مُہرِ محبت ثبت کرتے ہوئے کہا، ''میرے لال اب بہت وقت گزر گیا ہے۔ دیکھو اتنی تکلیف سے دماغ خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اپنی ماں کا کہنا مان، چل سو جا''۔ وہ والدہ کی تعمیلِ حکم میں چپ چاپ آ بستر

پر لیٹ جاتا۔ بستر پر بھی کافی عرصہ تک زیرلب کچھ گنگناتا رہتا۔ شاید وہ باقی حصہ کو جسے والدہ کی خاطر ترک کرنا پڑا تھا، حفظ کرتا ہوگا''۔

بالآخر چار سال کی سرگرم تعلیم کے بعد جب اس کے والد نے اس کے معلم کو خلعت جو کہ چار سو روپیہ نقد، ایک لنگی ریشمی اور چند دیگر ریشمی پارچات پر مشتمل تھی، دے کر رخصت کیا تو یوسف عزیز اُس وقت فارسی اور اردو کی ہر ایک مشکل سے مشکل کتاب بآسانی پڑھ اور سمجھ سکتا تھا۔ اُسے اگر افسوس تھا، ہاں نا قابلِ تشریح افسوس، تو عدم حصولِ تعلیمِ انگریزی کا.....

ہمیں اسی زمانے کا ایک دلچسپ خط ملا ہے جو پولیٹیکل ایجنٹ قلات نے 4 فروری 1930 کو یوسف کے 22 جنوری 1930 کی درخواست کے جواب میں لکھا۔ (کاش ہمیں یوسف کا خط بھی مل جائے)۔

''مجھے خدشہ ہے کہ میں آپ کو انگلینڈ میں کسی ایسی یونیورسٹی کا نام بطور مشورہ نہ دے پاؤں گا جہاں آپ تعلیم حاصل کر سکیں۔ میرا خیال ہے کہ جو تعلیم آپ کے پاس ہے، اُس سے آپ انگلینڈ کی کسی یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے اہل نہ ہوں گے''۔

مگر بعد میں بڑا ہو کر جب وہ انگلینڈ گیا تو اس نے لندن سے ایک خط میں کسی کالج کا ذکر کیا جہاں وہ دس بجے سے چار بجے تک ''کام'' کرنے کا تذکرہ کرتا ہے۔(8) یہ ''کام''، تعلیم ہے یا ملازمت، معلوم نہیں۔

3۔ باپ کا تختہ الٹ جاتا ہے

گو کہ نواب کیسر خان نے انگریز حکومت سے سی آئی اے اور نوابی کا خطاب پایا۔ مگر اس کے باوجود کیسر خان کا آزادانہ اور مقبول رویہ اُس زمانے کے برطانوی حاکموں کو اچھا نہ لگتا تھا۔ اُس شخص کے اندر کچھ کچھ ''اضافی'' بات تھی، ایک طرح کا ٹیڑھ تھا۔ انگریز کے ساتھ اُس کی وفاداری کے کٹورے میں اگر مکھی نہ بھی تھی تو تنکا تو ضرور پڑا ہوا تھا۔

واضح رہے کہ یہ پہلی عالمی جنگ کا زمانہ تھا۔ ایک طرف انگریز تھا اور دوسری طرف جرمنی۔

ترکی میں عثمان خاندان کی بادشاہی تھی اور وہ اس پہلی عالمی جنگ میں انگریز کے مخالف ملک جرمنی کا اتحادی تھا۔ لہٰذا اس نے جرمنی کی خوب مدد کی ۔ چونکہ نام کے اعتبار سے عثمان کی بادشاہت ایک مسلمان بادشاہت تھی، اس وجہ سے وہ سلطنت ، بلوچ مسلمانوں کے لیے بھی کشش رکھتی تھی۔ اور پھر بلوچ چوں کہ انگریز سے آزادی کی جنگ لڑ رہا تھا اس لیے فطری طور پر ہمارا عام آدمی انگریز کے مخالف ترک بادشاہ اور جرمنی کی طرف داری چاہتا تھا۔

ہمارے پاس کوئی مستند ثبوت یا حوالہ تو نہیں مگر ڈاکٹر عنایت اللہ کی یہ بات کچھ کچھ عقل کو لگتی ہے کہ نواب کیسر خان مگسی نے ترکی اور جرمنی کی حمایت میں جھالاوان کے انگریز دشمنوں اور جرمنی نوازوں کی خفیہ مدد کی تھی (9)۔

ایسی حالت میں اُس کے لیے دیر تک سرداری برقرار رکھنا ناممکن ہونا ہی تھا۔ چنانچہ خانگی تنازع کے الزامات لگا کر نواب کیسر کو ریاستِ کلات کے خان یا اُس ریاست کے اصل مالک یعنی انگریز کے قہر اور خشمگی کا شکار ہونا پڑا۔ ایک پلاسٹک اور اِلاسٹک سرداری جرگے نے اپنے سلیکٹرز کی منشا کے عین مطابق اسے 1922 میں نوابی سے معزول کر دیا (یہ انگریز ہی تھا جو جسے چاہتا نوابی عطا کرتا اور جب چاہتا، چھین لیتا۔ میں حیران ہوں کہ لوگ اس کے باوجود اپنی 'نوابزادگی' در نوابزادگی پر کیوں فخر کرتے ہیں)۔

واضح رہے کہ اُدھر کلات میں انگریز نے سال 1893 میں 55 سالہ خدائیداد کی بادشاہی چھین لی تھی، اور اس کے انتہائی غیر ذمہ دار، کھلنڈرے اور ظالم بیٹے محمود خان کو تخت پر بٹھا دیا تھا۔ انگریز نے برٹش پولیٹیکل ایجنٹ کے ساتھ ایک دیسی پولیٹیکل ایڈوائزر بھی لگا دیا۔ اسی عہدے کو بعد میں وزیراعظم کے عہدے میں بدل دیا گیا۔ جس پہ بالآخر شمس شاہ کو بٹھایا گیا۔ ''تکمیلِ انسانیت'' کے مطابق پانچ جماعتیں پڑھا ہوا سر شمس شاہ انتہائی چالاک، چالباز اور سفاک شخص تھا۔ (10)۔ اس جابر شخص کو 1918 سے لے کر 1932 تک یعنی پندرہ برس تک قلات کی حکمرانی ملی، مطلق العنان حکمرانی۔

اس کو قلات میں وسیع اختیارات حاصل تھے۔ قلات میں حکمرانی دراصل اُسی کی چلتی

تھی۔ اس نے انگریز افسروں کو اپنے ہاتھ میں لیا ہوا تھا۔ انگریز کی پالیسی چلانے کے علاوہ اُس نے ان کے لیے شکارگاہیں مخصوص کی تھیں۔ وہ اُن کے لیے سیر و تفریح اور شراب کی محفلیں سجاتا۔ اور ریاستی خرچے پر انھیں شاندار تحفے دیتا تھا۔ انگریز کی پشت پناہی سے وہ عوام پر ہر قسم کا ظلم کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔

محمود خان تو کلات (بلوچستان) کا نام نہاد خان تھا۔ آپ اسی بات سے اس کے اختیارات کا اندازہ لگالیں کہ وہ خود تو کلات میں ''تخت نشین'' تھا، مگر اُس کا بقیہ پورا شاہی خاندان انگریز کے ہاتھوں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔

خانِ کلات محمود خان نے مگسی قبیلہ کی سرداری کے اختیارات بھی ہتھیا لیے۔ حتیٰ کہ اس نے وہاں اپنے ہی متعین کردہ نواب، گل محمد مگسی کو گرفتار کرلیا۔ ریاستِ کلات سازش، جبر اور ظلم کی آماج گاہ بن چکی تھی۔ تحریر، تقریر اور اجتماع کی بنیادی انسانی آزادیوں کو سختی سے سلب کیا گیا تھا۔ روشن خیالی کی ہر بات، اور جمہور کے ہر آدرش کا اظہار گناہِ کبیرہ تصور ہوتے تھے۔

کیسر خان کو 1903 میں نوابی ''عطا'' ہوئی تھی اور 1922 میں ''چھنی''۔ یوں وہ 19 سال تک یہ ''دانگ'' (داغ) اپنے جسم کے ساتھ لگائے رہا۔

اب یہ سب کچھ چھن جانے کے بعد وہ 1923 میں ملتان پھسل گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انگریز نے اسے مع خاندان وہاں جلاوطن کر دیا ہو۔ ملتان میں وہ کہاں رہتا تھا، کیا کام کرتا اور اس کی رفاقت کن لوگوں کے ساتھ تھی، ہم نہیں جانتے۔ البتہ ملتان میں اس کی ''کچھ زمین تھی'' کا تذکرہ ملتا ہے۔

وہ ملتان میں دس ستمبر 1927 کو فوت ہوگیا۔ نواب کیسر خان مگسی وہاں بہاؤ الدین زکریا کے دربار کے احاطہ کے اندر دفن ہے۔ نواب نے دمدمہ پر ایک پانی کا کنواں زرِ کثیر خرچ کر کے احداث کرایا تھا۔ جس کے آثار مقبرہ کے قریب پائے جاتے ہیں۔ (11)

یہاں جَھل میں معذول شدہ کیسر خان کی جگہ اُس کے بڑے بیٹے گل محمد کو نواب بنا دیا گیا تھا۔

نواب گل محمد ایک بہت بڑا شاعر تھا۔ اور ہمارے عہد کے سارے اہلِ علم اُس کی زبردست عزت کرتے رہے۔اس کی فارسی شاعری پورے وسطی ایشیا میں مذہبی مدرسوں کے نصاب کے اندر شامل ہے۔

ہمیں تو کہیں 2017 میں یوسف عزیز کا افسانہ پڑھ کر سیاست میں اس بڑے شاعر کا مقام بہت متنازع معلوم ہوا۔سب سے بڑی قابلِ اعتراض بات تو یہی تھی کہ جب انگریز نے اس کے والد کو سرداری سے برطرف کر دیا تو اس نے ایسی غلیظ سرداری قبول کی ۔دوسرا اعتراض یہ کہ اُس کا باپ اور بھائی ملتان جلا وطن کر دیے گئے اور وہ ان سے قطع تعلق کیے جھل مگسی میں براجمان رہا۔اس کی تیسری، چوتھی۔۔۔غلطیوں کا تذکرہ آگے آتا رہے گا۔

گل محمد زیب، سردار تھا بھی اور نہیں بھی۔ ریاستِ کلات اِس امیر علاقے کو زیادہ سے زیادہ لوٹنے کی خاطر اِس سردار کے ہوتے ہوئے اُس کے قبیلے کو تنگ کرتی رہی ۔حتیٰ کہ ریاست نے علاقہ مگسی کا انتظام خود سنبھال لیا اور سردار زیب سے یہ تک لکھوالیا کہ ''وہ بیمار ہے، اس لیے سردار کی ذاتی ملکیت اور علاقہ مگسی کی دیکھ بھال اب ریاست کے ذریعے سے ہوگی''۔ زیب مگسی نے اس پر بھی کوئی عوامی احتجاج نہ بھڑکایا۔ بلکہ محض ایک بے جان سی شکایت انگریز سے کر دی کہ کلات کے وزیراعظم شمس شاہ نے یہ بیان اُس سے زبردستی لکھوالیا۔مگر شمس شاہ نے الٹا اُسے ہی گرفتار کرلیا اور اس کی ذاتی جائیداد اپنے نائب کے سپرد کر دی۔

تاریخ کا چلتا ہوا رہٹ دیکھیے کہ اسی گل محمد کو 1933 میں سرداری سے علیحدہ کیا گیا۔اور اس نے بھی باپ کی طرح اپنی بقیہ زندگی علاقہ مگسی سے باہر رہ کر گزاری۔ وہ 6 جنوری 1953 میں شہداد کوٹ میں فوت ہوگیا۔اُسے جھل کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

4۔ ملتان اور یوسف

آیئے، واپس آتے ہیں اپنے ممدوح یوسف عزیز مگسی کی طرف۔

یوسف اپنے والد کے ساتھ چار سال تک (1927-1923) ملتان میں رہا۔(12)

باپ کے ساتھ جلا وطن نواب زادہ یوسف علی خان اُس وقت ملتان گیا تھا جب پورے ہندوستان میں انگریز کے خلاف جدوجہد زوروں پر تھی ۔ایک طرف انڈین نیشنل کانگریس تھی جس کی سامراج دشمن تحریک بہت مقبول تھی۔ اسی طرح خلافت تحریک نے بھی لوگوں کو اچھا خاصا متحرک کر دیا تھا۔اور پھر، سوویت یونین کے سوشلسٹ انقلاب کے اثرات اِس برصغیر پر بھی پڑ رہے تھے۔

جگہ جگہ جدوجہد ہو رہی تھی۔ کہیں سیاسی جدوجہد جاری تھی اور کہیں مسلح لڑائیاں ہو رہی تھیں۔

ان انگریز مخالف تحاریک نے نوجوان یوسف کو بہت متاثر کیا۔ وہ ان تحریکوں کے قائدین کے بیانات اور تحریریں پڑھتا رہتا تھا۔''تکمیلِ انسانیت'' کے مطابق وہ متعدد رسالوں اور اخبارات کا مستقبل خریدار تھا۔اقبالؔ اور حالیؔ کی تصنیفات پڑھ کر اُس میں سیاسی حرکت و توانائی کا ایک ذخیرہ پیدا ہوا۔ وہ باقاعدگی سے جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، اور حسین احمد مدنی جیسے سامراج دشمن زعما کی تحریروں کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ اُس زمانے میں کمیونسٹ راہنماؤں کے خلاف چلنے والے مقدمات کی کاروائی چھپتی رہتی تھی۔ وہ ان خبروں کو بھی بہت دلچسپی سے پڑھتا۔

الغرض یہ دور انگریزوں کے خلاف ایک بہت ہی مقبول اور عوامی تحریک کا دور تھا۔ ہلچل بھری اس عوام دوست اور سامراج دشمن فضا نے یوسف علی خان کے سیاسی و نظریاتی عقائد کی ساخت اور پختگی میں اہم کردار ادا کیا۔

اور پھر شکوہ اور جواب شکوہ، اور دیگر اقبالی نظمیں اس نوجوان سردار کی سیاسی راہنما بنتی جا رہی تھیں۔(13)

5۔ محبت، منگنی اور شادی

ہمیں تاریخ اور جگہ تو معلوم نہیں، بس یہ پتہ چلا کہ یوسف عزیز نے (ملتان کی؟) مائی لال بی بی مگسی سے شادی کی۔ مگر وہ خاتون لاولد رہی۔ اور طلاق پائی۔ایک اور خاتون سے منگنی ہوئی مگر شادی سے قبل ہی دولہا کی برات کو موت اپنی اندھیری راجدھانی لے گئی۔ کوئٹہ کا مردم خور

زلزلہ یوسف کونگل گیا۔

ہم اپنے بزرگ کی پرائیویٹ زندگی میں زیادہ تاک جھانک نہیں کریں گے، اس لیے کہ ہمارے پاس معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ مگر وہ جب انگلینڈ میں تھا تو ایک حسینہ سے اس کی ایکوئیشن ضرور بن گئی تھی۔ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں۔ اس لیے کہ وہ کون سا بلوچ ہوگا جس نے حسن کے مائل قدم چومنے میں پس وپیش کیا ہوگا! سو یوسف بھی مستثنا نہ تھا۔ مگر بڑا آدمی ہر جگہ بڑا رہتا ہے۔ اس نے اس تعلق کو بھی اپنی آئندہ نسلوں کے لیے سبق بنا ڈالا۔

امین کے نام اُس کا خط دیکھیے:

''۔۔۔ بھائی! یورپ ہمہ تن شاعر اور دنیائے شعریت اور پھر یہ استفسار۔۔۔ مگر امین! یورپ کے متعلق آپ کے علمایانِ دین کی تمام رائیں غلط، یکسر غلط، بخدا کہ غلط۔ یورپ بہت آزاد ہے۔ آپ سے بازار میں، ریسٹورانوں میں، پارٹیوں میں آزادانہ عورتیں ملیں گی، باتیں کریں گی، کھیلیں گی، سنائیں گی اور رشتہ دار کوئی بھی دخل نہیں دیں گے۔ مگر اخلاقی لحاظ سے وہ برائی جو آپ کے دراز ریش حضرات اس سے منسوب کرتے ہیں، ایک فیصدی پائی جائیں گی۔ یہاں کی عورت اپنی عصمت کی حفاظت آپ کے رسم ورواج کے مطابق پردے اور تلوار و بندوق کے ڈر کے ذریعے نہیں کرتی، ان کا معیار کچھ اور ہے۔ کاش کہ میں تفصیلات لکھ سکتا۔ یہاں کی کنواری عورتیں اور وہ عورتیں، جو شادی شدہ ہیں، عصمت کے معاملے میں انتہائی معیار پر پہنچی ہوئی ہیں۔ باقی رہا آپ کی ہندوستانی معاشرت کے مطابق وہ طبقہ جو ساز وسرود کے ساتھ اعلانیہ بازاروں میں عصمت فروشی کرتا ہے، یہاں وہ ہے مگر مختلف رنگ میں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اُس رنگ میں جس سے دوسروں کو برائی کی ترغیب نہ مل سکے۔ مگر بہت کم، بہت کم۔

''آپ حیران ہوں گے، جب ایک کنواری یورپین لڑکی ایک دو بجے تک گھر سے باہر آپ کے ساتھ کسی پارک میں تنہا بیٹھی ہوئی ہے اور مختلف موضوعات پر بحث ہو رہی ہے۔۔۔ ممکن ہے شعر وشاعری یا محبت وغیرہ پر ہی بحث ہو، ممکن ہے وہ آپ کے ساتھ اقرارِ محبت بھی کرے۔ مگر کیا مجال ہے کہ ایسی رومانٹک فضا میں، یورپ کی زندہ کن فضا میں، تنہائی، نیم شب کا وقت، ایسے

وقت میں بھی اس کا خیال ایک لمحے کے لیے بھی عصمت فروشی کی طرف منتقل ہو۔ اگر بیوقوفی سے آپ کا خیال اس طرف منتقل ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اپنا وقار، اپنی اخلاقی حالت کو اس کی نظروں میں مجروح کر دیا۔ یہ ہے یہاں کی اخلاقی حالت۔۔۔

''یہاں کی عورتیں ہر قسم کی آزادی سے بہرہ ور ہیں۔ مردوں سے کھیلتی ہیں، ننگی ٹانگیں رکھتے ہوئے بازار میں پھرتی ہیں، دریاؤں میں تیرتی ہیں، جس چیز کو اچھا سمجھتی ہیں، انھیں خوف نہیں ہوتا کہ والدین مزاحم ہوں گے، آزادانہ تعارف پیدا کر کے سیر کرتی ہیں۔ اس کی وجہ سے انھیں دماغی عیاشی کی اُس بدترین شکل سے واسطہ نہیں پڑتا جیسا آپ کے علاقے میں، سمجھتی ہیں۔ عصمت کو صرف اُس کے لیے سمجھتی ہیں جو کہ ان کی زندگی کا رفیق ہو، وہ بھی باقاعدہ نکاح کے بعد، پہلے نہیں۔ شاذ ونادر۔۔۔ ہاں! میں نے شاذ ونادر کہا اس لیے کہ محض نا تجربہ کار، مردوں کے وعدہ شادی میں آ کر عصمت پہلے ضائع کرتی ہیں، مگر یہ معاملہ بہت کم ہے اور ہو رہا ہے۔

''اچھا اب رہا میں اور شاعری، مجھے تم جانتے ہو، سراپا شاعر۔ دس بجے سے لے کر چار بجے تک تو باقاعدہ کام کرنا پڑتا ہے کالج میں۔ اس کے بعد کبھی ہم جاتے ہیں تو کبھی ہمارے پاس اُن کو آنا پڑتا ہے۔ پُر لطف باتیں ہوتی ہیں، حسن کا قصہ بھی چھڑ جاتا ہے، عشق کا ساز بھی بجتا ہے، مگر ہندوستانی ساز نہیں۔ ہم اپنی مشرقی روح کے ترانے گا کر انھیں سناتے ہیں، وہ اپنے مغربی ساز کے بین بجا کر رومان طاری کرتی ہیں۔ مگر حاشا وکلا، جو معاملہ اس سے بڑھا ہو۔

''خیر! اس وقت تک تو ہم نے معاملہ زیرِ غور رکھا ہوا ہے۔ شریف ہے، معصوم ہے اور پیار کرتی ہے۔ ہم بھی کرتے ہیں مگر بھائی! حقیقت یہ ہے کہ ہم شادی کے قابل نہیں''۔ (14)

بس اتنی معلومات ہیں ہمارے پاس۔ اور یہ بھی کہ یہ خاتون شاید برٹش کمیونسٹ پارٹی کی رکن تھی۔

6۔ گل محمد سردار بنا

جیسے کہ ذکر ہوا، کیسر خان وہیں ملتان جلاوطنی بھگتتے بھگتتے 1927 میں فوت ہوگیا۔ آج بھی ، ملتان میں بہاؤ الدین ذکریا کے مزار پر حاضری دینے والوں کو مزار کے قریب چھت اور چاردیواری کی ہوئی ایک پکی قبر ملے گی جس پر کیسر خان نامی شخص کا نام لکھا ہوا ملے گا۔ یہی تو بلوچ قوم کے محسن، یوسف عزیز مگسی کا والد نواب کیسر خان ہے۔

ملتان جلاوطنی کے وقت یوسف کی عمر محض پندرہ برس تھی۔ چار سال وہ یہاں جلاوطن رہا۔ یعنی جب تک کہ وہ انیس برس کا ہوگیا۔ آپ تصور کریں کہ پندرہ سے انیس برس کا ایک نواب زادہ تو عجیب عجیب گاڑیاں رکھنے، اپنی گاڑی سے راہ گیروں کو کچلنے، اور وحشی دوستوں کے جھرمٹ میں منشیات کے استعمال، اور ویمنائزنگ میں مگن رہتا ہوگا۔ مگر یہ نواب زادہ اس کے برعکس کیسے نکلا؟۔ اُس کے ملتان کے چار برسوں کی زندگی کی بہت ساری تفصیل تو میسر نہیں مگر جو یوسف وہ وہاں سے بن کر نکلا، وہ کوئی نواب زادگی والی یوسفی نہ تھی۔ اُدھر سے تو ایک کندن برآمد ہوا۔

باپ کے انتقال کے وقت یوسف عزیز کے دو بھائی اور تھے۔ ایک تو سردار گل محمد جس کی عمر تقریباً پینتالیس برس تھی۔ اور یہ سوتیلی ماں سے تھا۔ چوں کہ بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے والد کی مسند کا جانشین ہونے والا تھا، اس لیے ''چھوٹا نواب'' کہلاتا تھا۔

اس احساس نے گل محمد کو ایک بے رحم اور پتھر دل انسان بنا دیا تھا کہ اب وہ چند دنوں میں 15 ہزار رعایا کی قسمت کا مالک ہونے والا تھا۔ مال کی کثرت، خودمختارانہ حکمرانی کا نشہ، اور بچپن کی تربیت کے فقدان نے گل محمد کو سفاک بنا دیا تھا۔ اپنی بہیمانہ خواہشات کی تکمیل کے لیے وہ ہر ایک ذلیل سے ذلیل، اور ننگِ انسانیت فعل کے ارتکاب سے بھی نہ جھجکتا۔ (15)

دوسرا چھوٹا بھائی یوسف کا ''ماں جایا'' تھا۔ اس کا نام محبوب علی تھا۔ اور اس کی عمر 15 برس تھی۔

نواب کیسر خان کے انتقال کے بعد کچھ دن تو اعزہ داری اور آنے جانے والوں کی

خدمت گزاری میں صرف ہوئے۔ اِن رسمی مظاہروں سے فراغت کے بعد نواب گل محمد کی رسم گدی نشینی منائی گئی۔ جس میں شہر کے تمام معزز رؤسا، وکیل، ڈاکٹر، مجسٹریٹ، ڈپٹی کمشنر، کمشنر شریک ہوئے۔

آخر کار وہ لمحہ بھی آ گیا جس میں کہ یوسف عزیز اور اس کے چھوٹے بھائی محبوب کی قسمتوں کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ گل محمد نے خود ہی اپنے چند ہم جیسوں کی وساطت سے تقسیم جائیداد کے متعلق سلسلہ جنبانی شروع کیا۔ یوسف عزیز نے اس کا جواب یوں دیا کہ؛ ''نواب گل محمد میرے بزرگ بھائی اور میرے لیے پدرانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم دونوں یتیم بھائی اس کو ہی اپنا باپ سمجھ کر اُس کے سایۂ عاطفت میں زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ ہم علیحدگی کے ہرگز خواہش مند نہیں۔ لیکن اگر وہ اس پہ مصر ہیں تو ہم بہ حالتِ مجبوری صرف ان کی خواہش کی تکمیل میں خلل انداز نہ ہونے کے لیے سب اختیارات ان کو دے دیتے ہیں۔ وہ جس طرح مناسب تصور فرمادیں، کریں۔''

اس نے زمینیں اور دیگر جائیدادِ غیر منقولہ کو تین حصوں میں تقسیم کرنے اور ایک حصہ خود رکھنے اور دو حصے دوسرے دو بھائیوں کو دینے والا رواجی اور منصفانہ کام نہیں کیا۔ اس نے اس کے الٹ کر دیا۔ اس نے خود کو دو حصے دے دیے اور اُن دونوں بھائیوں کو محض تیسرا حصہ۔

گل محمد نے جھٹ ایک مسودہ تیار کروایا۔ 5 لاکھ روپیہ نقد اور 3 سو گھوڑوں اور 150 اونٹوں اور مال مویشی کے گلے گل محمد نے اپنے پاس رکھے۔ اور دونوں بھائیوں کو کچھ نہ دیا۔ صرف موجودہ 5 لاکھ روپیہ کی تقسیم بھی یوں کی کہ دو لاکھ یوسف عزیز اور محبوب علی کو دیے اور تین لاکھ اپنے لیے رکھ لیے۔ اور اس تقسیم کو صحیح ثابت کرنے کے لیے یہ جواز دیا کہ چوں کہ نواب کو فرائضِ گدی نشینی اور انتظامیہ امورات سجھانے کے لیے زیادہ طاقت ور ہونے کی ضرورت ہے، اس لیے فریقین کی رضامندی سے یہی طے پایا۔

اس غیر قانونی، اور غیر اخلاقی فیصلہ کو جانتے ہوئے بھی یوسف عزیز نے اپنی شرافتِ

نفسی سے مسودہ پر خود بھی دستخط کر دیے، اور محبوب علی سے بھی دستخط کروا دیے۔ نواب نے فیصلہ ریاست کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ سے منظور کرا کے پکا کر دیا۔

گل محمد خان (1883-1953) ایک بہت بڑا اور منفرد طرز کا شاعر تھا۔ اُس بڑے عالم، فاضل اور قادر الکلام شاعر کا تخلص زیبؔ تھا؛ گل محمد زیبؔ۔ گل محمد زیبؔ مگسی۔

زیبؔ نے علم و ادب، شاعری اور فنِ شاعری میں ممتاز مقام حاصل کر لیا۔ وہ ہفت زبان شاعر تھا: اردو، فارسی، عربی، سرائیکی، ہندی اور سندھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے بلوچی میں بھی شاعری کی۔

زیبؔ مگسی نے عاشقانہ مضامین میں بھی خوب شاعری کی۔ بس کچھ اشعار یہاں لاؤں گا۔ دیکھیے زیب نے محبوبہ کی طرف سے تلخ بات کو کس قدر شیریں بنا دیا:

حرفِ سخت آمد بگوشم از لبِ رنگینِ او
زیبؔ سنگ از لعل پیدا گشت جائے عبرت است

یا

اخبار کی خبریں نہ سنا مجھ کو پیامی
معشوق کی جانب سے کوئی بات سنا خاص

اسی طرح وہ ایک اور نکتہ بیان کرتا ہے:

دل میں کاکل کو جگہ ہرگز نہ دے
اپنے گھر میں ہائے یہ کالا نہ چھوڑ

اس کے علاوہ اس نے مذہبی اور عارفانہ افکار کو بھی شعر کا زیور پہنایا۔ وہ خود مذہبی انسان تھا اور طریقت میں خواجہ غلام فرید سجادہ نشین چاچڑاں سے بیعت تھا۔

نہ دینے والا گو قارون ہو! ہے مفلسوں سے

تونگر درحقیقت وہ ہے جو دل کا تونگر ہو

یا

کون کس کا ہو سکے گا زیبؔ تقلیدی یہاں
ہے نمونہ اپنا ہر اک شخص کی دستار کا

زیب علم و عرفان میں اتنی ترقی کر گیا کہ پورے وسطی ایشیا میں اپنے زمانے کا بڑا فلسفی شاعر گردانا جانے لگا۔ زیبؔ دارِ عشق پہ مستانہ رقص کرتا ہوا اپنی زندگی گزارتا ہے۔ گو کہ اس کی سیاسی زندگی، بالخصوص اقتدار کے ایام درشت ترین تنقید کا نشانہ بنے مگر اسے ایک اچھے شاعر کی صورت یاد رکھا جائے گا۔ گل محمد عرفان کے سمندر میں غرق اور گردن تک وارفتگی میں ڈوبا ہوا فلسفی تھا۔ زیب مگسی لقائے یار کی گرویدگی میں سب کچھ تج دینے میں لحہ بھر توقف نہیں کرتا۔ اس بڑے شاعر نے حضرت عثمان مروندی (حضرت لعل شہباز قلندر) کے اشعار کی تضمین کی تھی۔ آیئے ذرا قلندر بادشاہ کی اپنی شہرہ آفاق غزل دیکھیے:

زِ عشقِ دوست ہر ساعت درونِ نار، می رقصم
گہے برخاک می غلطم گہے بردار، می رقصم
شدم بدنام در عشقش بیا اے پارسا اکنوں
نمی ترسم زرسوائی بہر بازار، می رقصم
بیاری مطرب و ساقی سماع و شوق رادردہ
کہ من از شادیِ وصل اش قلندر دار، می رقصم
اگر صوفی شدن خواہی بیاتا خرقہ پوشانم
چہ خوش زنار بربستم بہ ایں دیدار، می رقصم
مرا مخلوق می گویدگدا چنداں چرمی رقصی
بدل داریم اسرار ے ازاں اسرار، می رقصم
خلائق گر کند برمن ملامت زیں ہر دم

مگر نازم برایں ذوقیلہ پیشِ یار ، می رقصم
منم عثمان مروندی کہ یارِ خواجہ منصورم
نہ لرزم از ملامت آں کہ من بردار می رقصم

اب ذرا اس پہ زیبؔ مگسی کی تضمین کے کچھ مصرعے بھی دیکھئے:

بہ یادِ گردشِ آن چشم مست یارمی رقصم
بہ عشق ِابرویش برتیغ جوہر دارمی رقصم
بہ مستی بے خطراز طفتہِ اغیارمی رقصم
'' زعشقِ دوست ہر ساعت درون نارمی رقصم
گہے برخاک می غلطم گہے برخارمی رقصم''

اس کے دو شاہکار فارسی دیوان ''پنج گلدستہ زیب'' لکھنؤ (1931)، اور'' خزینتہ الاشعار'' لکھنؤ (1936) ہیں۔ تیسرا قلمی فارسی دیوان ''ارمغانِ عاشقان'' (1938) ہے۔

ہمارا یہ ملک الشعرا ستر سال کی عمر میں 1953 میں فوت ہوگیا اور اپنے آبائی شہر جھل مگسی میں دفن ہوا۔ (16)

ریفرنسز

1۔ مگسی، مرید حسین۔ تاریخِ مگسی قبائل۔۔۔۔ صفحہ 55
2۔ یوسف عزیز مگسی کے خطوط۔ 2017۔ خط نمبر 12، یوسف عزیز مگسی چیئر، یونیورسٹی آف بلوچستان۔ صفحہ 31
3۔ مگسی، یوسف عزیز۔ تکمیلِ انسانیت۔ 2017۔ یوسف عزیز مگسی چیئر یونیورسٹی آف بلوچستان صفحہ 1

4۔ کوثر۔ مکاتیب۔۔۔ صفحہ 3
5۔ خٹک خالد محمود۔ قرآن اینڈ حدیث اِن دی لیٹرز آف یوسف عزیز مگسی۔ بلوچستان ریویو، کوئٹہ۔ xxviii۔ جلد نمبر 1 2013۔ صفحہ 95
6- کوثر، انعام الحق۔ بحوالہ الحنیف جیکب آباد۔ فروری 1937
7۔ کوثر..... مکاتیب صفحہ 3
8۔ یوسف عزیز مگسی کے خطوط۔ مرتب شاہ محمد۔ 2017۔ یونیورسٹی آف بلوچستان، کوئٹہ۔ خط نمبر 53۔ صفحہ 115
9۔ بلوچ، عنایت اللہ، ڈاکٹر۔ یوسف عزیز مگسی کا انقلابی ورثہ۔ در کتاب پاکستان میں اردو، دوسری جلد از فتح محمد ملک۔ 2006۔ مقتدرہ قومی زبان پاکستان صفحہ 44
10۔ مگسی، یوسف عزیز۔ تکمیلِ انسانیت۔ 2017۔ یوسف علی مگسی چیئر۔ یونیورسٹی آف بلوچستان کوئٹہ۔ صفحہ 10
11۔ مگسی، مرید حسین۔ تاریخ مگسی قبائل (سالِ طبع اور پبلشر نہ دارد)۔ صفحہ 50
12۔ مصنف نامعلوم۔ بلوچستان میں اردو۔ الحنیف، جیکب آباد۔ فروری 1937۔ صفحہ 83
13۔ کوثر، انعام الحق۔ بحوالہ امین کھوسہ۔ نصرت، کراچی۔ 5 جون 1957
14۔ یوسف عزیز مگسی کے خطوط۔ مرتب شاہ محمد۔ 2017۔ یونیورسٹی آف بلوچستان، کوئٹہ۔ خط نمبر 53۔ صفحہ 115
15۔ مگسی، یوسف۔ تکمیلِ انسانیت۔ صفحہ 6
16۔ شرافت، عباس۔ گل محمد زیب کی کتاب '' زیب نامہ'' کے پیش لفظ میں۔ 1995۔ انجمنِ فارسی بلوچستان۔ صفحہ 26

تیسرا چیپٹر

بلوچ تو ہوتا ہی سیاسی ہے!

1۔ساون کی بھڑکائی آگ

1929 یوسف عزیز مگسی، انڈین نیشنل کانگریس کے 44ویں اجلاس میں شرکت کے لیے لاہور جانے کا ارادہ کرتا ہے۔اُس وقت جواہر لال نہرو اِس پارٹی کا صدر تھا۔

بادشاہ پرست احباب مگسی صاحب کو زمانے کے نشیب و فراز سمجھانے کی خوب کوششیں کرتے ہیں۔ظاہر ہے جانے سے منع کرتے ہیں۔مگر یہ شراب تو اسے ''لڑ'' چکی تھی۔آزادی نامی محبوبہ اُسے ہپناٹائز کر چکی تھی۔وطن دوستی کے بپھرے ہارمونوں نے اب واپس بیس لائن پہ لوٹنے سے انکار کر دیا تھا۔چنانچہ وہ 24 دسمبر کو لاہور چل پڑا۔لاہور، جس نے اس کی اولاد کا اصل دشمن بننا تھا۔لاہور، جس نے اُس کی اولاد کا اصل دوست بننا تھا۔

مگسی لاہور چلا گیا اور کانگریس کا کھلا اجلاس اٹینڈ کیا۔نہرو نے صدارت کی۔اور گاندھی نے ایک یادگاری تقریر کی۔

اس اجتماع میں ملوکیت شکن نعروں نے اس وطن پرست نوجوان کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیا۔

اسی سیشن میں نہرو نے (31 دسمبر 1929، اور یکم جنوری 1930) کی رات دریائے راوی کے کنارے آزاد انڈیا کا سہ رنگا پرچم لہرا دیا۔

لاہور کانگریس نے پورے ہندوستان میں ایک نئی امید اور مسرت بکھیر دی ۔ اسی کانگریس نے سول نافرمانی بشمول ٹیکسوں کی عدم ادائیگی کا اختیار بھی ورکنگ کمیٹی کو دیا۔ اس نے اسمبلی کے سارے ممبروں سے استعفے دینے کا مطالبہ بھی کیا۔

تب سے دنیا نے دیکھ لیا کہ اگلے ساڑھے پانچ برس تک مگسی نے خود کو بہت ڈویلپ کیا۔ بقول محمد امین کھوسہ، ''بلوچستان کے اولین اولوالعزم نوجوان صاحب دل رہنما یوسف اعظم بلوچوں کے ایک سردار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ نوجوان دنیا کے سب رہنماؤں سے واقف ہیں۔ سندھ بلوچستان اور پنجاب کی مختلف بڑی بڑی سوسائٹیوں کی اصلی زندگی سے واقفیت حاصل کرنے میں یکا یک ان کے دل کی گہرائیوں میں سے ایک سوال اٹھتا ہے کہ ان کا مادرِ وطن بلوچستان کا نرم پھول بظاہر ذلیل وخوار ہے۔ ان کی جہالت، ان کی باہمی جنگ وجدل کا باعث بنی ہوئی ہے۔ ان ہی سوالات کے جوابات پر وہ غور وفکر کر رہے تھے تو انھیں علامہ اقبال کا کلام دستیاب ہوا۔ اقبال کے کلام میں ایک صحیح آدمی کے صحیح جذبات ابھارنے کی پوری طاقت موجود ہے لیکن شرط یہ ہے کہ آدمی بھی صحیح ہو اور جذبات بھی صحیح ہوں ۔شکوہ جوابِ شکوہ اور اقبال کی دیگر نظمیں اس نوجوان سردار کی سیاسی رہنما بنیں اور آناً فاناً یہ ناز ونعم میں پلا ہوا نواب زادہ اپنی قوم میں سے جہالت اور مفلسی دور کرنے کے خیال سے بلوچستان کے استبدادی حلقہ پر یلغار کرتا ہے''۔(1)

اور پھر بلندی کے سفر کو محض موت نے روکنا تھا۔ کاش بلوچوں میں کوئی جان رِیڈ ہوتا اور یوسف پہ ''Eight years that shook Balochistan'' نامی کتاب لکھتا۔

2۔ مُرتہ محمود خان۔۔!!

''مر گیا محمود خان، ورنہ تمھارے کان کاٹ دیتا''۔ یہ ایک ضرب المثل ہے اُس محمود خان کے متعلق جو محمود خان دوم کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وہ ریاستِ کلات کا بادشاہ تھا۔ عجب

بادشاہ تھا وہ ہمارا۔ مگر ہم اُس کی جوانی سے متعلق دلچسپ اور مقبولِ عام قصّوں کی بات کسی اور جگہ کے لیے موقوف کرتے ہوئے یہاں صرف اُن باتوں کا ذکر کریں گے جو یوسف عزیز مگسی سے متعلق ہیں۔

بہت ہی عیاشی اور رنگ رلیوں بھرا ایک مختصر دورِ حکومت چلانے کے بعد، 1925 میں یہ ''خان'' اپنی بصارت کھو بیٹھتا ہے۔ یوں، اُس کا دستِ راست اور اُس کی اسٹیبلشمنٹ کا سربراہ وزیراعظم شمس شاہ اب باقاعدہ طور پر ریاست کے سیاہ وسفید کا مالک بن گیا۔

ہسٹری تماشے تو کرتی رہتی ہے ۔ معلوم نہیں حالات نے کیسے انگریز سادیت پسند (Sadist) افسروں، سادیت پسند شمس شاہ اور سادیت پسند بلوچ سرداروں کی ٹولی یکجا کی۔ اسی لیے یہ دور بلوچ ہسٹری کے تاریک ترین ادوار میں سے ایک بنا۔ سوچے سمجھے انداز میں جہالت، افلاس، اور قومی افتخار سے خالی پن ہماری قومی مزاج کے مٹکے میں انڈیل دیے گئے۔ (ہم یہاں شمس شاہ کے مظالم کی بات اس لیے نہیں کریں گے کہ آگے مگسی صاحب خود اپنی شہرہِ آفاق تحریر ''شمس گردی'' کے اندر اس کی تفصیل دیتا ہے)۔

مذکورہ بالا گھپ اندھیرے میں کسی نہ کسی یوسف نے تو یہ خالی جگہ پُر کرنا ہی تھا۔ تاریخ، اقوام کو دیر تک سونے کہاں دیتی ہے؟۔ فطرت اپنی متحرک مخلوق کو ساکت صرف قبرستان میں کرتی ہے!۔

اسی دوران یوسف کے والد کا انتقال ہوتا ہے ۔ مگسی صاحب نے اپنے افسانے میں اپنے والد کی موت کی تاریخ یوں لکھی ''.....ابھی عمر کی اکیسویں بہار میں قدم رکھنے والا تھا کہ سایہ سے محروم ہو گیا''۔ مگسی صاحب کی پیدائش 1908 تھی۔ اس میں 21 سال ڈال دیں تو یوں اُس کے والد کے انتقال کا سن 1929 بنتا ہے۔

3۔ فریادِ بلوچستان

(17 نومبر 1929)

ژوب کا میرا بزرگ ساتھی سائیں کمال خان شیرانی ہمارے ایک دوست کی تصانیف

پڑھتا رہتا تھا۔ (وہ بھلا کس کی اور کیا کیا تصانیف نہیں پڑھتا تھا؟)۔ گو کہ اُس کے اس دوست نے بلوچی میں بھی تھوڑا بہت لکھا مگر اُس کی زیادہ تصانیف اردو میں ہیں۔ اور کمال خان (اور میر عبداللہ جان، اور شاہ محمد) کے خیال میں اردو کے ساتھ ساتھ اُس دوست کو بلوچی میں بھی کافی کچھ لکھنا چاہیے۔ مگر، ساتھ ساتھ کمال خان کا یہ بھی خیال تھا کہ اُس دوست کی اردو بہت اچھی ہے۔ لہٰذا تعریف اور طنز دونوں کو ملا کر ایک بار اس نے ژوب سے ایک خط میں اُسے لکھا؛ ''اگر اردو والوں کو ذرا بھی حیا ہو تو وہ ملاّ عبدالحق (بابائے اردو) کا چوغہ تمھیں انعام میں دے دیں''۔

سائیں تو بہت دلچسپ آدمی تھا، کُند چھری سے کاٹتا تھا۔ بات آئی اور چلی گئی۔ مگر اب جب کہ میں اپنے اِس بزرگ یعنی یوسف عزیز مگسی کی خوبصورت اردو تحریر دیکھتا ہوں تو مجھے یقین ہو چلا ہے کہ اردو والوں میں سائیں کے بتائے ہوئے اوصاف موجود نہیں ہیں۔ وگرنہ وہ لوگ ملاّ عبدالحق کا چوغہ یوسف عزیز مگسی کی زیارت پہ کب کا رکھ چھوڑتے کہ یہ کسی اور کا نہیں، اُسی کا حق ہے۔

میر یوسف عزیز مگسی نے کوئی تلوار اور تفنگ اٹھا کر لڑائی شروع نہ کی۔ حالاں کہ یہ سب کچھ وافر مقدار میں اِس بڑے قبیلے کے سردار کے پاس موجود تھا۔ اُس کی خوش نصیبی کہ اسے ایک اور طرح کا اسلحہ بھی میسر تھا؛ قلم، کاغذ اور اخبار۔ یہی اُس کے ادب اور شاعری کے میدان تھے اور یہی اس کی سیاست کی رزم گاہ۔ یوسف عزیز مگسی اپنی بہت ہی مختصر زندگی میں کاغذ، قلم، اور اخبار کو بنیاد بنا کر ایک بہت بڑی تحریک کا بانی بنا۔

میں حیران ہوتا ہوں کہ اِس بلوچستانی لیڈر کو ''اِسکرا'' کی اہمیت کا احساس کیسے ہوا۔ ہم جب جب اخبار اور یوسف کے ساتھ کا تذکرہ کریں گے، ہم حیران ہی ہوتے رہیں گے۔ تحریک کا ترجمان (آرگن) تو ایک بہت پیچیدہ شعور تھا۔ بالخصوص جب پڑھنے والے تعداد میں بہت کم تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ بلوچستان میں اخبار منگوانا اور پڑھنا دونوں ممنوع تھے۔ جرمانہ اور جیل کی سزا ہوتی تھی۔

یوسف مگسی نے جدوجہد کے کسی اور راستے کو برا بھلا نہیں کہا۔ بس اپنا راستہ متعین کیا۔

اور اِسی راستے یعنی قرطاس و قلم کے ذریعے کو اپنی جدوجہد کا ذریعہ بنایا اور اسے جا رہی رکھا۔ اسی سے باقی راستوں کے لیے بھی بڑی آسانیاں اور راہنمائیاں ملی۔

نظریہ، مصمم ارادہ، فنڈز، اور اخبار کے علاوہ ایک اور نعمت اُسے یہ حاصل تھی کہ اسے ایک ہی وقت میں بلوچی، فارسی، عربی، انگلش، سندھی، سرائیکی اور اردو زبانوں پہ عبور حاصل تھا۔ (2)

یوسف عزیز مگسی اس نے تاریخ کی ضرورت کی عین مطابقت میں قلم کا پہلا وار کیا؛ ''فریادِ بلوچستان'' کے نام سے۔

''فریادِ بلوچستان'' کا ذکر یہاں اس لیے بھی بہت ضروری ہے تا کہ آج نئی نسل اُس زمانے کے بلوچ سماج کے بارے میں اچھی طرح جان سکے۔ بلوچستان کی ابتر صورت حال یوسف علی خان جیسے حساس اور ہندوستان میں چلنے والی انگریز دشمن عوامی تحریک سے متاثر شخص کے لیے قطعاً قابلِ قبول نہ تھی۔

آلِ عثمان کی سلطنت (خلافتِ عثمانیہ) کی تباہی و بربادی اور مسلح جہاد کی عارضی ناکامیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ریاست کلات اور اُس سے منسلک علاقوں میں برطانوی استعمار نے ظلم و جبر کو تیز تر کر دیا تھا تا کہ یہاں آزادی کے تصور کا گزر بھی نہ ہونے پائے۔ اسی جبر و بربریت کے خلاف نوجوان مجاہد میر یوسف علی خان نے آواز اٹھائی۔

اس نے لاہور کے اخبار ''مساوات'' میں 17 نومبر 1929 میں ''فریادِ بلوچستان'' کے نام سے ایک مضمون لکھا۔ اس میں قوم کو ہدایت تھی کہ نعرۂ اللہ اکبر سے استعمار پسندی کی زنجیریں جھٹک کر پھینک دو، اور میدانِ جہاد میں سر بکف ہو کر نکلو۔ مضمون کا بقیہ حصہ شمس شاہ کے فرعونی مظالم کے خلاف تھا جو کہ ''ریاست پر 18 سال سے مامور تھا۔ وہ ایک طاغوتی قوت کا اوتار تھا۔ چوں کہ وہ گورنمنٹ برطانیہ کا بڑا خیر خواہ تھا، اور ریاست کی تمام پیداوار اُنھی انگریزوں کی خوشنودیِ مزاج پر صرف کی جاتی تھی اس لیے پبلک کی چیخ و پُکار اور واویلا کے باوجود وہ زیادہ مضبوط پوزیشن حاصل کرتا گیا۔ اس کی تعلیم صرف پرائمری تک محدود تھی۔ مگر مشہور ہے کہ روپیہ قاضی الحاجات ہے، اس لیے تمام برٹش پولیٹیکل آفیسر اُس کے اس عیب کو نظر انداز کیے جاتے

تھے‘‘۔

یہ تحریر دراصل بلوچ قوم کے نام ایک اپیل تھی.....غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی اپیل ،معاشی و سیاسی آزادی حاصل کرنے اور پھر تعمیر و ترقی کے کام میں جت جانے کی اپیل۔ یہ بلوچ حقوق کے لیے اولین تحریری مسودہ تھا۔ ملاحظہ کریں:

’’وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

’’اس سے بڑھ کر بے حسی اور کیا ہوسکتی ہے کہ بلوچستان بالخصوص ریاست قلات کے باشندے باجود زبردست قومی طاقت کے مالک ہونے کے، آئے دن ذلیل اور بے عزت ہورہے ہیں۔ افسروں کے دفتروں کے سامنے کئی کئی گھنٹے محض اس امید پر کہ شاید ’’درِ کعبہ‘‘ وا ہو اور ان کو زیارت نصیب ہو، بیٹھے رہتے ہیں۔ مگر اس کعبہ کو کیا پڑی ہے کہ اس کا در ایسے گرے ہوئے اور ذلیل و خوار طالبانِ دیدار کے لیے ایک منٹ کے لیے بھی کھل جائے ۔ کیا ایسے حضرات سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ بلوچستان یا ہندوستانی کہلاسکیں گے اور اپنے ہندوستانی بھائیوں کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی کھوئی ہوئی عزت برقرار رکھنے کے لیے قربانیاں دیں گے۔ یا سرکاری افسروں کی متکبرانہ اور متمرانہ رویہ کا اپنے جذبہ خودی اور غیرت سے انسداد کریں گے۔ حالات تو حد درجہ یاس انگیز ہیں۔

’’بلوچستان کی حالت کس قدر افسوس ناک ہے ۔کاش‘ کہ ایسے بے غیرت فرزند اس کی گود میں پرورش ہی نہ پاتے ، اور موت نے ان کا کام تمام کردیا ہوتا۔ باوجود اتنی حق تلفیوں کے کسی افسر کی ’’ٹی پارٹی‘‘ یا سر شمس شاہ وزیر اعظم ریاست قلات کے ساتھ دو منٹ ہنس کر باتیں کرنا، اگر کبھی نصیب ہوجاتا ہے تو بھی فوراً روحانی اور جسمانی معراج حاصل ہوجاتا ہے۔ رونا آتا ہے ان کی اس سمجھ پر!

’’اب دیکھئے سردار بہادر نواب محمد اسد اللہ خان رئیسانی کو ۔سر شمس شاہ

ریاست قلات کی آڑ میں ان کو دبا کر یہ چاہتے ہیں کہ وہ بھی اور سردارانِ بلوچستان کی طرح ان کی تعریف کے گیت گایا کریں۔ مگر بلوچستان کا یہ غیور فرزند ایسی حرکات بھلا کیوں پسند کرے گا۔ اب ہمارے عقل کی بوالعجبی ملاحظہ ہو، کہ ریاست قلات کے دوسرے سردار صاحبان بجائے اس کے کہ اپنے ایک ایسے غیور بھائی کی ایک جائز امر پر امداد کرتے ، اپنی عزتِ قومی کا ثبوت دیتے ، وہ سر شمس شاہ کے خوانِ کرم کی ریزہ چینیوں کی خاطر سردار صاحب موصوف سے قطع تعلق کرنے پر آمادہ ہوگئے ہیں۔ کیا یہی حضرات بلوچستان کی عزت کو قائم رکھ سکتے ہیں؟ شیخ سعدیؒ نے خوب کہا کہ:

’’مرانان دِہ وکفش برسر بزن‘‘۔ (مجھے روٹی دو اور جوتا میرے سر پر مارو)

’’پٹھان اور بلوچ قوم ایک زبردست فاتح اور غیور قوم تھی اور سارے ہندوستان میں یہ علاقہ ایک طاقتور علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ مگر کون جانتا تھا کہ ہم اس طرح سے قعرِ ذلت میں گر جائیں گے اور اپنے شریف اور بہادر آباؤ اجداد اور ان کی شاندار تاریخ کو حرفِ غلط کی طرح مٹادیں گے۔

’’نہ معلوم بلوچستانی کب بیدار ہوں گے، اور اپنے ان فاتح اور غیور آباؤ اجداد کا نام روشن کریں گے اور صحیح معنوں میں بلوچستانی اور ہندوستانی بنیں گے؟

’’آج ساری دنیا شاہراہِ ترقی پر گامزن ہے مگر بلوچستانی کچھ ایسے سوئے ہوئے ہیں کہ جاگنا حشر کو معلوم ہوتا ہے۔ بلوچستانیوں سے ہماری مخلصانہ درخواست ہے کہ خدا کے لیے ساری دنیا کو ہنسنے کا موقع نہ دیجیے۔ یہی وقت ہے، اگر اسلاف کا خون آپ میں اب تک موجود ہے تو اٹھیے اور اس طرح اٹھیے جس طرح آپ کے اسلاف اٹھا کرتے تھے۔ سیاسی غلامی کی زنجیروں کو ایک نعرۂ حریت لگا کر توڑ ڈالیے اور قوموں کے لیے مشعلِ راہ بنائیے۔ باہمی حسد و رقابت اور ان لغویات کی بیخ کنی کیجیے کہ جنگِ آزادی میں تم سے زیادہ کوئی بہادر نہ نکلے اور تم سے پہلے وہ جامِ شہادت نوش نہ کرے۔ خدا کے لیے بزدلانہ اور رجعت پسندانہ ذہنیت کو مٹادیجیے اور دیکھیے تاریخ کیا کہتی ہے۔ مادرِ وطن کی قربانیوں سے سبق حاصل کیجیے۔

کاش! کہ بلوچستان بھی شہیدِ وطن ’’جیتندر ناتھ‘‘ جیسا ایک سپوت پیدا کرتا!‘‘

***

یہ مضمون بہت پراثر اور دردناک تھا۔اس میں بلوچستان کی پسماندگی، محرومی اور عوام کی غلامی کی کیفیتوں کو اس نے بہت اچھی طرح بیان کیا۔ظاہر ہے کہ مضمون جب بلوچستان پہنچا تو عوام نے اسے بہت پسند کیا۔ اوراس مضمون نے ہزاروں دلوں کو متاثر کر کے جدوجہد کے لیے آمادہ کرلیا۔قلم کی طاقت کو کبھی کم نہ سمجھا جائے!!

یہ نوٹ کرنا چاہیے کہ مگسی صاحب کی اِس تحریر (فریادِ بلوچستان) کے وقت بلوچستان میں محمود خان دوم نے اس طرح کا ماحول بنا رکھا تھا کہ اگر کوئی بلوچ برصغیر کے کسی اخبار میں بلوچستان کے معاملات پر مضمون لکھتا تو گویا وہ انتہائی گھناؤنا جرم کرنے کا مرتکب ہوجاتا۔

چنانچہ جب یہ مضمون چھپ کر بلوچستان پہنچا تو سرکار اور دربار میں ہلچل مچ گئی۔حاکم آگ بگولہ ہوگئے۔سرداروں کی پیشانیوں پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ریاستِ کلات نے بلوچستان میں اے.جی.جی سے میر صاحب کی گرفتاری کے لیے دباؤ ڈالا۔

چنانچہ مگسیوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ دیے گئے۔ناظم جھل مگسی موہن سنگھ نے عوام پر مزید ٹیکس لگائے اور اُن پر ظلم وستم کی انتہا کردی۔تو دوسری طرف یوسف عزیز مگسی کے کوئٹہ میونسپل کے حدود سے باہر جانے پر پابندی لگادی۔(3)

بالآخر 3 جنوری کا وہ منحوس یا سعید دن بھی آ پہنچا، جب اس ناز ونعم کے پروردہ نوجوان کو پولیٹیکل ایجنٹ سبی نے طلب کیا۔اور وہ آرٹیکل یوسف عزیز کو پڑھ کر سنایا گیا۔یوسف نے کہا کہ،''انگریز پولیٹیکل ایجنٹ ایک ثالث کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا فرض ضرورت پڑنے پر ریاست کے راعی اور رعایا کے درمیان انصاف کو قائم رکھنا ہے۔چونکہ مجھے کامل احساس ہے کہ آپ شمس شاہ کے زیر اثر اپنی حقیقی پوزیشن قائم نہیں رکھ سکتے، اس لیے میں خاموش ہوں۔''

تین مہینہ کی پیشی پڑی۔یوسف کو پولیٹیکل ایجنٹ نے شمس شاہ کے حوالہ کردیا کہ وہ اسے تاریخِ پیشی تک ریاست کے جیل میں رکھے۔15 جون 1930 میں اس کی گرفتاری عمل میں

لائی گئی۔میر یوسف علی خان پر ریاست میں بغاوت پھیلانے کا الزام لگایا گیا اور ایک جرگے میں اس پر مقدمہ چلانے کیا فیصلہ کیا گیا۔اوراس وقت تک اُسے مستنگ جیل خانہ میں رکھا گیا۔

ارواح' جسمانی ملاپ سے بہت قبل اپنے وصل کا سامان کرتی ہیں۔ہوا' وفا کا سب سے موصل میڈیم ہوتی ہے۔ہوا، جو سطح سمندر سے لے کر خلا میں زمین کے گریویٹیشنل حدود تک ہر رکاوٹ کو عبور کرتی جاتی ہے۔ہوا، ہونٹ اور کان کے بیچ ترت ترین اور معتبر ترین رابطہ کار ہوتی ہے۔جناب صمد خان اچکزئی کے یہ فقرے دیکھیے:

''دیکھو نواب مگسی کا بیٹا یوسف علی بھی گرفتار ہوا، مستنگ جیل میں ہے۔وہ بھی لاہور کانگریس میں گیا تھا۔ہم اس بات پہ بہت خوش ہوئے کہ کتنی اچھی بات ہے کہ ایک ساتھی مل گیا۔یہ صاحب بعد کی زندگی میں میرا سیاسی ساتھی رہا۔بلوچستان کی قومی زندگی میں بہت پیارا، بڑا اور بلند مرتبہ سربراہ بن گیا۔بہت پیارا اور عقل مند شخص تھا۔اُردو اور فارسی پر بہت دسترس رکھتا تھا۔۔۔اس کو بھی ہماری قید کا مستنگ جیل کے داروغہ سے معلوم ہوا تھا۔اور اس بات پہ ایک بہت شیرین نظم لکھی تھی''۔(کاش یہ نظم مل جائے!)۔

اس پڑھے لکھے قیدی کو مستنگ جیل میں کسی قسم کے اخبار یا رسالہ، یا مطالعہ کے لیے دوسری کتب نہیں ملتی تھیں۔ریاست کلات کی ہدایت کے بموجب اسے ہر قسم کی روحانی تکالیف دی گئیں۔

تاریخ پیشی 7 جولائی 1930 تھی، چنانچہ اُس روز کلات کے مقام پر سرداروں کا جرگہ منعقد ہوا۔اس جرگہ میں سردار محمد خان شاہوانی، سردار سمندر خان محمد شہی، سردار بہرام خان لہڑی، سردار رسول بخش زرکزئی، اور سردار رسول بخش مینگل شامل تھے۔(4)

ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس جرگے نے کیا فیصلہ دیا ہوگا۔بلوچستان میں جرگہ کی ناانصافیوں کی فہرست بڑی ہی لمبی ہے۔ویسے بھی عدالتیں انصاف کے لیے کم ہی بنتی ہیں۔بلکہ اس کے برعکس عدالتیں تو حاکم طبقات کی پشت پناہی کرنے کا ہتھیار رہی ہیں۔حضرت یسوع کا جرم کیا تھا جسے عدالت میں چوروں کے ساتھ کھڑا کیا گیا تھا۔صرف یہی نا کہ اس نے حکمران سماجی نظام کو

بے انصاف قرار دیا تھا۔ سقراط کو محض سچا ہونے پر زہر پلایا گیا تھا۔ گیلیلیو کی ناجائز سزا کی معافی تو صدیوں بعد اب پوپ نے مانگی ہے..... عدالت، جرگہ اور وہ بھی سامراجی انگریز کا قائم کردہ جرگہ!! پورے انگریز دور میں ایک بھی جرگے میں کسی بھی سیاسی مقدمے کا آپ کو کوئی مبنی برحق فیصلہ نہیں ملے گا۔ وگرنہ میر عبدالعزیز کرد، خان عبدالصمد خان اچکزئی، میر یوسف عزیز مگسی جیسے لعل، بھلا جیل میں ڈالے جانے کے لائق لوگ تھے؟۔

سرداروں نے رائے دی کہ؛ ''یہ اپنی نوعیت کا پہلا مقدمہ ہے۔ اس لیے کہ اس سے قبل کسی نے اس طرح کے جرم کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔ اس عمل سے ریاست میں بدامنی، بے چینی، اور انتظام میں خلل پیدا ہونے کا خدشہ اور خطرہ ہے۔ کانگریسی خیالات کی تشہیر و اشاعت بذاتِ خود ایک عظیم جرم ہے۔''

جرگے نے میر یوسف علی خان کو بدخیال اور گمراہ لوگوں کے خیالات سے متاثر شدہ شخص قرار دیا۔ اسے ''درستیِ خیالات کے واسطے'' اس کے ماموں سردار رسول بخش زرکزئی کے پاس گٹ زہری میں ایک سال نظر بندی کی سزا سنائی۔ ''جبکہ بارہ ہزار نوسو روپے جرمانہ عائد کرتے ہوئے دس ہزار روپے کی ضمانت نیک چلنی بھی اخذ کی جائے۔''(5)

(ہم کتنے بڑے انسانوں کی آل اولاد ہیں!)۔

اس مختصر سے مضمون پر اتنی بھاری ظالمانہ سزا سے اُن مشکلات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے جو بلوچ قومی تحریک کے اولین رہنماؤں کو درپیش تھے۔

4۔ جیل، اور اُس کے اثرات

اُدھر جَھل میں یوسف کے جیل نما نظر بندی میں جانے کی وجہ سے اُس کا چھوٹا بھائی، محبوب علی تنہا اور بے یارومددگار رہ گیا۔ اُدھر سے سوتیلا بڑا بھائی گل محمد جس کا ضمیر احساسِ محبت اور جذبۂ ہمدردی سے قطعاً بیگانہ تھا۔ اُسے یوسف عزیز کی روزافزوں مقبولیت اور ہردل عزیزی

نے رقیبانہ جذبات کی پرورش پر مجبور کردیا تھا۔ وہ عرصہ سے ایسے موقع کے انتظار میں تھا۔ اب یوسف کی اسیری اور محبوب کی خوردسالی و ناتجربہ کاری سے اُس نے نہایت ہی سرعت سے فائدہ اٹھانے اور اپنی خودغرضانہ خواہشات کی تکمیل کی ٹھانی۔ اس نے مقامی افسران کے کان بھرنے شروع کیے۔ اُس نے یوسف کو ایک مادرزاد انقلاب پسند اور دشمنِ حکومت ثابت کرنے کی کوششیں شروع کیں۔

ریاستِ کلات ظالم ترین ریاستوں میں سے ایک رہی ہے۔ اُس کا وزیراعظم شمس شاہ بہت سفاک اور مکار شخص تھا۔ ریاست کی سخت گیری اور استبداد ہی کی وجہ سے اب تک ریاست میں کسی قسم کی تحریک نے جنم نہ لیا تھا۔ پبلک جلسہ تو کجا، دس بیس کی مجلس میں بھی اگر کوئی ملکی اصلاحات اور موجودہ نقائص کا ذکر غلطی سے کر بیٹھتا تو بے مقدمہ چلائے سالوں تک جیل کی چکی پیستا۔ ویسے تو اُس زمانے کی فیوڈل ریاستیں اکثر قانون وانصاف سے محروم سمجھتی جاتی تھیں، مگر جس قسم سے قانون وانصاف کا خون اس ریاست میں ہوتا رہتا تھا، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ (غضب دیکھیے کہ ریاست آج بھی وہی ہے جو محمود خان کے زمانے میں ہوا کرتی تھی، بس نام کلات سے پاکستان ہوگیا)۔

چوں کہ ریاست، یوسف عزیز کو زیادہ سے زیادہ تکلیف میں دیکھنے کی متمنی تھی، اس لیے اس نے گل محمد کی آڑ میں، ایسا جال تیار کیا کہ گل محمد کی ایک درخواست پر یوسف اور محبوب کی جاگیر جو اُن کو حصہ میں دی گئی تھی، تاحکمِ ثانی کورٹ آف وارڈز میں داخل کی گئی۔ محبوب ناتجربہ کاری کی وجہ سے کچھ نہ کرسکتا تھا۔ اور کرتا بھی کیا جب کہ پولٹیکل ایجنٹ سے ریذیڈنٹ تک سب سامراج اور استبداد کے نمائندے تھے۔ ان پے درپے مصیبتوں کے نزول سے بے چارہ محبوب جس نے کبھی غم کی شکل تک نہ دیکھی تھی، کس حالت میں ہوگا، اس کا اندازہ وہ دِل کرسکتا ہے جس پر کبھی ایسی گزری ہو۔ بھلا بیس تیس افراد پر مشتمل کنبہ اور امیرانہ حیثیت سے رہنے کے عادی اب کیسے گزارہ کرتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ دنوں سے لے کر ہفتوں تک فاقہ پر

نوبت پہنچی۔ یوسف علی پابندی کی حالت میں اپنے پسماندگان کی یہ حالت سن کر خاموش ہو جاتا۔ اور کبھی اُس کی زبان سے حرفِ شکایت نہیں نکلا۔(6)

5۔خیرالناس من ینفع الناس

کسی پسماندہ معاشرے میں ایک باصلاحیت دماغ، بہت دلچسپ طرز پہ ارتقا کرتا ہے۔ مروج کو مسترد کرتے رہنے کا سلسلہ اُسے بہتر کی تلاش کی طرف رواں دواں رکھتا ہے۔ ہر پڑاؤ پہ شعور مزید وسیع، مزید غنی ہوتا چلا جاتا ہے۔ مگسی صاحب بھی ایسا ہی جی نیئس انسان تھا۔ اب کے اُس نے ''لوگوں میں سے بہتر وہ ہے جو دوسرے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے'' کے نعرے کے تحت کام کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اور یہ ارادہ اس نے 21 مئی 1932 کو میر تاج محمد ڈومبکی کے نام لکھے گئے خط میں ظاہر کیا:

''قریبی عرصے سے میرا ارادہ سندھ بالخصوص جیکب آباد میں (جو مرکز ہے بلوچوں کا) بلوچ بھائیوں کی امداد سے فی الحال ایک انجمن حزب اللہ یعنی خدائی فوج کی بنیاد ڈالنے کا ہے، جس کے اغراض و مقاصد واضح ہیں۔ یعنی دینِ الٰہی اور قیام بر دینِ الٰہی کی تبلیغ۔ باقی جو کچھ ہوگا اِن دو شقوں کے تشریحی سلسلے میں محسوب ہوگا۔''(7)

واضح رہے کہ ہمارے خطے میں اُس دور کی ساری سامراج دشمن عوام دوست تحریکوں نے اسلام کے ترقی پسند پہلو کو رہبر بنا رکھا تھا۔ اُس زمانے کی ساری سیاسی شاعری، ادب، صحافت اور سیاست میں آپ کو ہر جگہ یہی کچھ ملے گا۔ بلوچستان میں بھی، ہندوستان میں بھی، اور دوسرے علاقوں میں بھی۔

میر یوسف علی بھی اس حلقے کا شخص تھا۔ اُس جیسے متحرک اور لپک جھپٹ جیسے شخص کا سارے موجود تضادات کا ادراک کرنا اور انہیں استعمال کرتے رہنا سمجھ میں آتا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ لندن جانے سے ذرا پہلے تک یوسف مگسی سیاسی مذہب سے خوب خوب وابستہ تھا۔ جہاں ملاّ، پیر کی گنجائش تو نہ تھی اور رجعت و قدامت پرستی سے بھی یارانہ نہ تھا، مگر پوری دنیا میں اسلام کا جھنڈا

لہرانے کی خواہش پکی تھی۔

6۔انجمن اتحادِ بلوچستان

خیالات کس راستے سے آتے ہیں؟۔ زمینی سے، ہوائی سے یا بحری سے، کوئی نہیں جانتا۔ اسی لیے بڑے سے بڑا فرعون بھی خیالات کی درآمد برآمد پہ پابندی نہ لگا سکا۔ وہ فرعون خواہ قدیم زمانے کا ''فرعونِ بے سامان'' تھا، یا آج جدید ترین ٹکنالوجی سے مسلح ''فرعونِ باسامان ہو''۔

خیالات پر کون قابو پا سکا ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ خیالات تو غیر محسوس طور پر پھیلتے ہیں، نفوذ کر جاتے ہیں۔ نظر آئیں تو عوام اپنے فائدے کی چیزیں اُچکنے میں دیر نہیں لگاتے۔ چُھپ جائیں تو اپنے مٹانے والوں کی ''دھبل'' نامی دوربینوں سے بھی دیکھے نہ جائیں۔

اچھے نظریات آتے ہی حسین کونپل بن جاتے ہیں، پھل پھول بن جاتے ہیں، جڑیں بڑھاتے ہیں۔ جتنا وَیری ان کی شاخیں کاٹ ڈالے گا اتنا ہی ان کی جڑیں زمین دوز ہوتی چلی جائیں گی۔

خیالات کی اسی آزادانہ آمدورفت والی خصلت کا تماشا دیکھیے کہ مگسی صاحب جن دنوں اس مقدمے کے سلسلے میں مستونگ جیل میں تھا، تو میر عبدالعزیز کرد کے ساتھیوں نے اس سے خفیہ رابطہ قائم کیا۔ یہ لوگ ''انجمنِ اتحادِ بلوچاں'' کے نام سے ایک حد درجہ خفیہ پارٹی چلاتے تھے۔ یہ قلم کاغذ کے لوگ تھے۔ چنانچہ مگسی صاحب کے پاس لٹریچر کی آمدورفت شروع ہوئی۔ اور اُسے ممبر بننے کی دعوت دی گئی۔ ملک فیض یوسف زئی کے بقول، ''اس سے رابطہ، خطوط کے ذریعے ہوتا تھا جسے جیل میں صفائی کرنے والا سویپر اپنے جھاڑو میں چھپا کر لے جاتا''۔

خیالات کا تبادلہ ہونے لگا اور یوسف عزیز مگسی نامی یہ بڑا انسان، آزادی نامی حسینہ کے دام میں مکمل طور پر گرفتار ہو گیا۔ وہ نہ صرف فکری طور پہ ترقی کر گیا بلکہ اس رابطے نے مگسی صاحب کے لیے وہ حالات اور اسباب بھی پیدا کر لیے کہ وہ عملی سیاست میں قدم رکھے۔

یوسف عزیز جو پہلے ہی باعمل انسان تھا، اب کے نظر بندی نے، اور نظر بندی کے دوران

انجمن کے لٹریچر اور مکالمے نے اُسے اپنی سمت متعین کرنے میں زبردست مدد دی۔ اُسے اندازہ ہوگیا کہ اُس کے لیے زندگی کے معانی تبدیل ہو چکے ہیں۔ اب اس پہ یہ کھلا کہ زندگی مسلسل اور پیہم عمل کا نام ہے۔ اُس کی زندگی کا مقصد انگریز سے آزادی اور سماجی انصاف کا حاصل کرنا متعین ہو چکا تھا۔ اس لیے نتیجے سے بے نیاز ہوکر زیست کی لڑائی میں حصہ لینا ہی اس کی زندگی ٹھہری۔ شکست تو پہلے سے موجود تھی کہ وطن انگریز کے قبضے میں تھا۔ جیت کے دور دور تک آثار نہ تھے۔ اس لیے بے نیاز ہوکر انسان کی خیر اور آبادی کے لیے جدوجہد کے بے انت جھیل کو دنا تھا۔

میر یوسف علی خان دس ہزار روپیہ جرمانہ بھر کر، 4 ماہ قید اور ایک سال نظر بند رہ کر اگست 1931 کو رہا ہوگیا۔

ذرا سا عرصہ اُس نے اپنے خانگی، قبائلی اور کاشتکاری کے بکھرے بگڑے امور کے لیے الگ کر دیا۔ اور جب وہاں کی زندگانی کی زلفیں ذرا سنوریں تو اُس نے بڑے مقصد کی طرف رخ کرلیا۔

بلوچ بڑی قوم تھی اور بلوچستان بہت وسیع تھا۔ کہاں سے ابتدا کی جائے؟۔ معاملات کا سِرا کہاں پہ ہے؟۔ مگسی صاحب نے کوئٹہ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ کوئٹہ آ کر اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ وہ ''انجمن اِتحاد بلوچاں'' میں اعلانیہ شامل ہوا۔ اُس کے پارٹی میں شامل ہونے سے پارٹی نے بھی اپنا حلیہ بدلا۔ اور وہ اعلانیہ کام کرنے لگی۔ اُسے جلد ہی پارٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔

انجمن اتحادِ بلوچاں اب تک ایک خفیہ تنظیم کے بطور کام کر رہی تھی۔ اس کو اس قدر خفیہ رکھا گیا تھا کہ اس کے تمام ممبر رات کو میر عبدالعزیز کُرد کی بیٹھک عزیز آباد مستنگ میں جمع ہو جاتے اور صبح روشنی پھیلنے سے قبل اپنے اپنے گھروں کو واپس پہنچ جاتے۔ ملک فیض محمد یوسف زئی صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ روزانہ چھ سات میل کا سفر پیدل طے کر کے پڑنگ آباد سے مستنگ جاتا۔

انجمن کی ممبر سازی کا طریقہِ کار بھی خفیہ ہوتا تھا۔ کسی نئے آنے والے کو اُس وقت تک مقاصد سے آگاہ نہیں کیا جاتا تھا جب تک کہ اس کو اعتبار کے قابل نہ سمجھا جاتا۔ اس دوران اس کو ٹرائل بیس پر اچھی طرح پرکھا جاتا۔ اُس کے بعد حلف لیا جاتا۔ حلف بھی بہت ہی دلچسپ ہوا کرتا تھا۔ ممبر سے

قرآن شریف کی سورۃ یٰسین کے حاشیہ پر دستخط لیے جاتے تھے کہ وہ ہمیشہ انجمن کا وفادار رہے گا اور سرکار کے سامنے کوئی راز افشاں نہیں کرے گا۔

اُن لوگوں کی رفاقت کچھ دیگر پروگریسو انقلابی نوجوانوں کے ساتھ تھی جنھوں نے بلوچ قوم کو باوقار و آزاد قوم کے بطور قائم کرنے کے لیے قرآن شریف پر دستخط کر کے حلف لے رکھا تھا۔ ان میں محمد اعظم شاہوانی، سید امیر شاہ، ملک سعید دہوار، اور دیگر شامل تھے۔ میر یوسف علی خان مگسی شامل ہوا تو تحریک میں ایک نئی جان پیدا ہوگئی۔

مگسی صاحب نے صحافت کی اہمیت جان لی تھی۔ لہٰذا وہ لاہور اور کراچی میں اِن شعبوں سے متعلق ہم خیال لوگوں کی صف بندی میں لگ گیا۔ خود لکھا، دوسروں کو لکھنے کی ترغیب دی اور کئی اخبارات کو اپنی طرف، بلوچ کی طرف کر دیا۔

مگسی صاحب نے پارٹی کی تنظیم کاری کی طرف بھی بہت توجہ کی۔ اس کی ممبر شپ بڑھانے کی کوشش تیز کیں، اس کی مرکزی اور علاقائی باڈیز کے الیکشن کروائے۔

انجمن نے کلات سٹیٹ میں منتخب پارلیمنٹ کا مطالبہ کیا تا کہ ایک ذمہ دار آئینی کابینہ ہو۔ اس اقدام کا مطلب یہ ہوتا کہ سرداری جرگہ نظام کا خاتمہ ہو اور بالواسطہ مگر بڑی حد تک برطانوی حکمرانی کا خاتمہ ہو۔ یہ خواب گو کہ آج تک شرمندہِ تعبیر نہ ہوا، لیکن یہ تو ہوا کہ بلوچوں کو حتمی سمت مل گئی۔

7۔ ریاستِ کلات کے مظالم

ریاستِ کلات کی سیاہ حکمرانی اور اس کے مظالم تھے کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہے تھے۔ رعایا کی زندگی تلخ تھی۔ سیاسی کارکن تو باقاعدہ نشان زدہ دشمن ہوتا تھا۔ ہر طرف گھٹن تھی، پابندیاں تھیں، اور بند ماحول تھا۔ ایک عمومی مایوسی اور بے بسی طاری تھی۔ کوئی راہ سوجھتی نہ تھی۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔

عام آدمی (کسانوں) کو انسان نہیں سمجھا جاتا تھا۔ وہ ہمہ وقت بیگار کے لیے طلب کیے جاتے تھے۔ ''آج کچی سڑکوں پہ پانی کا چھڑکاؤ کرنا ہے بے گار پہ آجاؤ!۔ آج کوئی معزز مہمان آرہا ہے، سڑک پر دور دور تک اس مہمان کے استقبال کے لیے صبح سے شام تک کھڑے ہوجاؤ۔ فلاں سرکاری تعمیرات میں بیگار کے طور پر مشقت کرو۔ سڑکوں کی مرمت و دیکھ بھال بلا معاوضہ کرو۔۔۔'' اور پھر ٹیکس، مالیہ، جرمانہ، فیسیں۔۔۔ نہ صرف ان کی شرح بڑھتی جاتی تھی بلکہ ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جاتا۔ کاریز پہ ٹیکس (ریاست کی بلا سے کہ اس میں پانی ہے بھی کہ وہ سوکھ چکا ہے)، کورٹ فیس کے علاوہ پیشی کی تاریخ مقرر کرنے کی رشوت دو، وگرنہ معمولی بات پہ چھ چھ ماہ سال سال تک پیشی در پیشی، التوا در التوا بھگتو۔ یہاں تک کہ خزاں کے موسم میں گرتے پتوں پہ بھی ٹیکس لگا دیا گیا۔ قیدیوں پہ جرمانے، ان سے بیگار پہ کام لینا۔ حتیٰ کہ انھیں کھانا تک لوگوں سے مانگ مانگ کر کھانا پڑتا تھا۔ فصلات پہ بٹائی، بٹائی کے تخمینے پہ رشوت۔ اور بٹائی جلد کرانے پہ پیسہ دو، ورنہ چھ ماہ تک کٹائی شدہ فصل بارش و جھکڑ میں کھلے میدان میں پڑی رہے گی۔

کلات کی پوری ریاست میں محض ایک مڈل اور بارہ پرائمری سکول تھے۔ آج کی نیم سول نیم فوجی، نیم قبائلی، نیم فیوڈل، نیم بازاری اور نیم سامراجی حکومت کی طرح اُس زمانے میں بھی سکول کھولنے کے وعدے اور اعلان بہت ہوتے تھے مگر بنتا کچھ بھی نہ تھا۔

اس ظلم و سفاکی کے خلاف ''انجمن اتحادِ بلوچاں'' سے وابستہ کارکن و راہنما سراپا احتجاج بن گئے۔ ایسے میں یوسف عزیز مگسی اور میر عبدالعزیز کرد نے 20 نومبر 1931 میں 64 صفحات پر مشتمل ایک پمفلٹ لکھا جس کا نام 'شمس گردی'' رکھا۔ (ایک حکمتِ عملی، جس میں پوری سٹیٹ کے مظالم کو بے نقاب بھی کیا جائے، مگر نظام اور ریاست کی بجائے بظاہر ایک فرد کو ذمہ دار قرار دیا جائے!، وزیر اعظم شمس شاہ کو)۔ فقرے دیکھیے:

''ہم اور ہماری انجمن دربارِ کلات کے شاہی نظام کو پورے احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور اسی طرح ہم کو گورنمنٹ آف انڈیا اور برٹش لوکل گورنمنٹ بلوچستان کے آئینی اور قانونی اقتدار

کا احترام ہے۔ ہماری موجودہ اور آئندہ کی سرگرمی صرف شمس شاہ کے شخصی مظالم اور بے اعتدالیوں کے برخلاف ہوں گی''۔

''شمس گردی'' نامی اِس پمفلٹ میں دراصل ریاست کے مظالم اور ناروا حکمرانی کو تفصیل سے بے نقاب کیا گیا۔

بلوچ سیاسی تاریخ میں ''فریادِ بلوچستان'' کی طرح ''شمس گردی'' بھی اولین دستاویزات میں سے ایک ہے۔ ان دستاویزات نے یہاں کی سیاست کو جدید جمہوری شکل دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ پمفلٹ، پوسٹر، وال چاکنگ، پریس کانفرنس، اور جلسہِ عام جیسے سیاسی ذرائع اس سے قبل بلوچستان میں مستعمل نہ تھے۔ ''شمس گردی'' اِس جانب سفر کا سنگِ میل تھی۔ اس پمفلٹ میں رشوت خوری، استبداد اور ظلم کی تفصیلات بیان کی گئیں۔

مگر جب بھاگ بگڑے ہوئے ہوں تو خود اپنا کندھا تک ساتھ نہیں دیتا۔ شمس گردی اور اس کے بعد روزنامہ زمیندار میں یوسف کے مضامین کی تردید اُس کے اپنے بھائی گل محمد سے ہی کروائی گئی۔ اس نے ایک تفصیلی تردیدی خط نما مضمون اخبار کو بھیجا جو اخبار کے 26 نومبر 1931 کے صفحات میں چھپا۔ وہ یوں ہے:

''مکرمی جناب مدیر ''زمیندار'' السلام علیکم!

''چونکہ مکسیوں کے معاملہ کا تعلق بالخصوص میرے ساتھ ہے کیونکہ میں مکسیوں کا سردار ہوں، اس لیے میں افرادِ مگسی کے مختصر حالات سے آپ کو آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ تاکہ حقائق کا آپ کو علم ہو سکے۔

''آپ کو یقینی طور پر معلوم ہونا چاہیے کہ میر یوسف علی خان مگسی جو میرا سوتیلا بھائی ہے، ایک نوجوان شخص ہے۔ اس سے پہلے اس نے والد محترم نواب کیسر خان مرحوم کے خلاف ان کی زندگی میں ان پہ نہایت شرمناک الزامات لگا کر انھیں نہایت ذلت کے ساتھ بلوچستان سے آؤٹ کرایا تھا۔ جس کے باعث انھیں مجبوراً ملتان کی طرف رہنا پڑا، جہاں وہ انتقال فرما گئے۔

''والد کے انتقال کے بعد میر یوسف علی خان نے والد کے لاکھوں روپیہ پر ملتان میں قبضہ کر

لیا۔ والد کے بعد چونکہ سرداری کا حق میری طرف منتقل ہوگیا، اس لیے میر یوسف علی خان کو یہ بات ناگوار گزری اور اس نے بعض شریر مگسیوں کی انگیخت پر آبائی جائیداد کے متعلق مجھ سے جھگڑا کیا۔

''آخری فیصلہ کے مطابق والد مرحوم کی جائیداد کا تیسرا حصہ اُسے ملا۔ اور یہ حصہ اسے رعایتاً مگسیوں کے رواج کے خلاف محض اس لیے دیا گیا کہ وہ میرا وفادار اور اطاعت گزار رہے گا۔ مگر اس کی یہ خواہش اور تمنا روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے کہ وہ میری جگہ سردارِ قوم مقرر ہو۔ جس کی خاطر وہ شریر اور فتنہ انگیز قومی افراد سے مل کر انگیخت، شرارت اور رخنہ اندازیاں کرتا رہا اور اس نے ریاستِ قلات اور حکومتِ بلوچستان کے خلاف اخبار ''مساوات'' لاہور میں جو عرصہ سے بند ہے، بغاوت پھیلانے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس حرکت پر اُس سے سختی کے ساتھ باز پرس کی گئی۔ اور دس ہزار روپیہ جرمانہ کیا گیا۔ اور سزائے قید دی گئی۔ اور اسے ہدایت کی گئی کہ وہ اپنی روش کی اصلاح کے لیے اپنے ماموں سردار صاحب زرک زئی کی نگرانی میں رہے۔ جرگہ کی طرف سے یہ سزا نہایت نرم تجویز کی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس تجویز پہ بھی عمل کیا جانے والا تھا کہ میعاد کے گزرنے پر وہ بغیر اجازت اپنے علاقہ سے بیرون علاقہ میں نہ جائے۔ لیکن میر یوسف علی خان نے اس کی مطلقاً پرواہ نہ کی اور اس کی خلاف ورزی کر کے پنجاب و ہندوستان کی طرف فرار ہوگیا۔ اور اب مگسی قوم کے بعض شریر افراد کی معیت میں اس نے اخبارات میں یہ فتنہ انگیزیاں شروع کر دی ہیں۔

''میری قید کے متعلق اخبارات میں جو کچھ لکھا جا رہا ہے۔ بالکل بے حقیقت اور از سرتا پا غلط اور بالکل غلط ہے۔

''نہ تو میں ریاست کی طرف سے قید کیا گیا اور نہ مجھ پر کسی قسم کی نگرانی وغیرہ کی جا رہی ہے۔ میں بالکل آزاد ہوں۔ بعض شریر اور فتنہ انگیز افرادِ مگسی جو میر یوسف علی خان کے مشیر و ہمراز ہیں، کوشش کر رہے تھے کہ میری جائیداد کی آمدنی غصب کر لی جائے۔ کیونکہ ان ایام میں میں بیمار تھا اس لیے میں نے اپنی جھل والی جائیداد کو مجبوراً کورٹ آف وارڈ کرایا۔ تاکہ وہ ان کے ناجائز دست برد سے بچ جائے۔ اس طریق پر عمل کرنے سے جائیداد سے یوسف علی خان یا اس کے رفقا کو بھی کچھ حاصل نہ ہو سکا۔

''اس سے پہلے موسم گرما کی وجہ سے میں علاقہ جھل سے باہر کوئٹہ و مستنگ کی جانب مقیم تھا۔ اور آج کل حضور ہز ہائی نس والئی قلات میں کلات سٹیٹ کونسل کے دیگر ارکان و سردارانِ قبائل کے ہمراہ بحیثیت سردار قوم کارِ سرکار میں مصروف ہوں۔

''مگسیوں کی ہجرت اور میرے مصائب کے متعلق جو کچھ شور اور شر اخباری دنیا نے بپا کر رکھا ہے، وہ بالکل افترا ہے۔ بعض مگسی جو یوسف علی خان کی انگیخت پر سندھ کی طرف چلے گئے ہیں، ان میں سے بہت سے اپنی سکونت پر علاقہ جھل میں واپس آ چکے ہیں۔ اور بعض عنقریب رفتہ رفتہ واپس آ جائیں گے۔ حسین بخش مگسی اور ان کے رفقا بھی یوسف علی خان کی رفاقت کا دم بھر رہے ہیں۔ اور اس کی علت یہ ہے کہ حسین بخش وغیرہ کا میرے ساتھ جائیداد پر ناجائز مقدمہ چلا آتا ہے جس کا فیصلہ سرداروں کے جرگہ کے ذریعے نہایت مناسب اور منصفانہ ہو چکا ہے۔ لیکن وہ خواہ مخواہ ہٹ دھرمی کر رہے ہیں۔

''میں امید کرتا ہوں کہ آپ ان حالات کو اپنے اخبار میں شائع فرما کر مجھے ممنون کریں گے۔ نیز میر یوسف علی خان اور اس کے رفقا کو جو اپنی شرارت اور فتنہ انگیزی سے کام لے کر عالی جناب والاشان نواب میر شمس شاہ وزیر اعظم قلات کے خلاف ناجائز پروپیگنڈا کر رہے ہیں، ہدایت کریں گے کہ وہ اس قسم کی شرارتوں سے اپنے آپ کو اور قوم کو نیز مجھ کو ناقابلِ برداشت مصائب میں ڈال کر خراب و خستہ نہ کریں۔ اور اپنے علاقہ میں واپس جا کر پُر امن طریق پر اپنی زندگی بسر کریں''۔

لگتا ہے ''بردارانِ یوسف'' والا معاملہ بلوچ کے لوحِ محفوظ کے ہارڈ ڈسک میں ازل سے ڈال دیا گیا تھا، ابد تک کے لیے!!۔ ہئے بے بختی!

8۔ مگسی ایجی ٹیشن

دست از طلب نہ دارم تا کامِ من برآید

یا جاں رسد بہ جانان یا جاں زِتن برآمد

حافظؔ

اگر گوادر و چاہ بہار سے لے کر دہلی تک، اور نیمروز سے لے کر جیلسمیر تک کے بلوچوں تک میری رسائی ہوتی تو میں ان سے ''شمس گردی'' نامی کتابچہ ضرور پڑھواتا۔ یہ اولین بڑا مسودہ ہے جس میں بلوچ نے اپنی آزادی، آبادی اور مساوات کی سرحدیں بیان کی تھیں۔

20 نومبر 1931 میں انجمن اتحادِ بلوچستان اور مگسی مہاجرین کی طرف سے ''شمس گردی'' نام کا ایک زبردست پمفلٹ شائع ہو کر نمودار ہوا جس کا ذکر ہم شروع میں کر چکے ہیں۔ یہ گویا ریاستِ کلات کے جرائم کا ایک وائٹ پیپر تھا۔ یہ بہت ہی مدلل، دلچسپ اور ادبی پیرائے میں لکھا گیا تھا۔ چونسٹھ صفحات والے اس پمفلٹ میں ریاستی مظالم اور وزیرِاعظم کی ذاتی کمزوریوں کو بیان کیا گیا۔ ذیلی سرخیاں یہ تھیں: ''قبائلی آزادی کی پائمالی، طبقہِ زمینداران پر مظالم، حقوقِ ملازمت میں رعایا کُشی، نظامِ عدل میں ابتری، ملک میں تعلیم کا فقدان، خزانہ کی بربادی۔۔۔''

میں بلوچوں کے لیے ''شمس گردی'' کو امریکی تحریکِ آزادی کے زمانے کے ''کامن سینس'' نامی کتابچے کے برابر کی اہمیت کا گردانتا ہوں۔ ابھی تک کسی محقق نے ہمارے داخلی تضادات اور ہماری اندرونی چپقلشوں پہ اس طرح سے سیر حاصل کام نہیں کیا۔ اس پمفلٹ نے آمریت اور ظلم میں ڈھکی بلوچ ریاست کے اصل چہرے کو بے نقاب کر کے دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اس سے عوام الناس، بالخصوص پڑھے لکھے لوگوں میں عقل و شعور کے نغمے پھوٹے، اور ریاستِ کلات کی حکومت کا دیوالیہ پن اور اس کے برپا کردہ مظالم کی تفصیل عام و خاص کے سامنے آ گئے۔

سچی بات ہے کہ شمس گردی میں بیان کردہ حقائق پر ہی یوسف عزیز مگسی (لہٰذا بلوچ قوم) کی پوری سیاست استوار ہوئی۔ عوام الناس کے ساتھ عمیق ہمدردی اور ظالم کے خلاف کرخت نفرت اُس اولین سیاسی دور کی پہچان بن گئیں۔

خانِ کلات محمود خان طویل بیماری کی وجہ سے موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھا۔

ریاست کلات کی اسٹیبلشمنٹ شہزادہ میر محمد اعظم جان کے خلاف تھی۔ اور وہ محمود خان کے بڑے بیٹے محمد انور کو ولی عہد مقرر کرنے کے لیے قانونی و مذہبی جواز مہیا کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں سردارانِ کلات کو اپنا ہم نوا بنانے کے لیے خوف، لالچ اور ترغیبات دیے جا رہی تھی۔

مگر، انجمن اتحادِ بلوچاں کے جمہوری اور باشعور کارکن شمس شاہ وزیرِاعظم کی ظالمانہ حکومت کے بدترین مخالفوں میں سے تھے۔ لہٰذا وہ ہر میدان میں اُس کا مقابلہ کرنے اور اسے شکست دینے پر تُلے ہوئے تھے۔

اب ذرا مسکراہٹ لدے ہوئے موڈ کے ساتھ اگلی سطریں پڑھیں۔ ہم آج کی بات نہیں کر رہے بلکہ ہم پچھلی صدی کی تیس کی دہائی کی بات کر رہے ہیں۔ اُس وقت تک نظریہِ پاکستان اور لیاقت علی خان وغیرہ کا وجود بھی نہ تھا۔ سیدھی سیدھی داخلی جدوجہد تھی ہماری۔ عوام بمقابلہ کلات کی حکومت۔ عوام کی قیادت انجمن اتحادِ بلوچاں نامی سیاسی پارٹی کر رہی تھی۔ اور حکومت کا سربراہ شمس شاہ تھا۔ اس باہمی چپقلش کے عین عروج پہ حکومت نے انجمن اتحادِ بلوچاں پر ''گریٹر بلوچستان'' بنانے اور شاہ افغانستان سے گٹھ جوڑ کرنے اور سازش کرنے کے الزامات عائد کیے۔ (ہم سیاسی کارکنوں کو عرصے تک پتہ نہیں چلا کہ افغانستان کا ایجنٹ ہونے کا الزام بھٹوئی اور ضیاء الحقی نہیں ہے۔ یہ تو قدیم الزام ہے۔۔۔ کچھ الزامات کس قدر سدابہار اور دیرپا رہتے ہیں!)۔ بلوچ اپنا ہر نیک قدم رکاوٹوں، بہتانوں، دلیلوں اور مباحثوں کی بوچھاڑ کے اندر اٹھاتا رہا ہے۔ اُس کے بارے میں قائم موجودہ اچھا تاثر اُسے آٹومیٹک طور پر نہیں ملا۔ بہت کشٹ اٹھانے پڑے اسے۔

سرکار نے عوام کی اس پارٹی کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ جب جماعت کے خلاف حکومت کی جارحانہ کاروائیاں حد سے بڑھ گئیں تو جماعت نے کلات کی ریاستی بیوروکریسی کے بچھائے جال کو بیخ و بن سے اکھاڑنے اور حقوق حاصل کرنے کے لیے بااثر ایجی ٹیشن چلانے کا اعلان کیا۔ اس طرح کہ مگسی لوگ کلات ریاست کے علاقے جھل مگسی کو چھوڑ کر سندھ میں داخل ہونا شروع ہوئے۔ اس نقل مکانی کو ''مگسی ایجی ٹیشن'' کے نام سے شہرت ملی۔ ''مگسی ایجی ٹیشن'' اس لیے کہ مہاجرین میں مکسیوں کی اکثریت تھی۔ وگرنہ اس میں مینگل اور محمد

حسنی قبائل بھی شامل تھے۔(8)

اِس ایجی ٹیشن کے آٹھ مطالبات تھے:

1۔ ریاست کلات میں دورِ استبداد کا خاتمہ ہو۔

2۔ کلات کی خالی شدہ مسند کے لیے ایک ایسے بیدار مغز فرماں روا کا انتخاب عمل میں لایا جائے جو دستوری اور ذمہ دار حکومت کا اعلان کرے، جمہور کے منتخب نمائندوں کی ایک اسمبلی قائم کرے، اور ایک عادل اور لائق وزیر اعظم کا تقرر عمل میں لائے۔

3۔ قبائل کی قبائلی آزادی سلب نہ کی جائے۔

4۔ کاشتکاروں کو بے پناہ مظالم کا تختۂ مشق نہ بنایا جائے۔

5۔ ملازمت میں رعایا کے حقوق کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

6۔ نظامِ عدل کو ایک حقیقت شئے بنایا جائے۔

7۔ تعلیمِ عام کا خیال رکھا جائے۔

8۔ ریاست کا روپیہ گھوڑوں اور کتوں پہ خرچ نہ کیا جائے۔

قلات کے وزیر اعظم نے یوسف کو پھر گرفتار کرنے کے وارنٹ جاری کر دیے۔ مگر وہ قبل از وقت اطلاع پا کر جیکب آباد چلا گیا تھا۔ جہاں سے اُس نے نقل مکانی کرنے والے ہزاروں افراد (جن میں مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے شامل تھے) کی قیادت سنبھال لی۔ اس پوری ایجی ٹیشن کو منظّم کرنے کے بعد اس نے مگسی قبائل کے ایک سو معتبرین کا ایک وفد ساتھ لیا اور کلات کے جور و استبداد کے خلاف شکایت کرنے وائسرائے ہند کے پاس دہلی چلا گیا۔

یوسف مگسی کی ایک اور خوب صورت خاصیت یہ تھی کہ وہ کسی بھی سیاسی اقدام کو مقامی رہنے نہ دیتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک بار پھر مگسی ایجی ٹیشن کے سلسلے میں اخبارات کو بھرپور انداز میں استعمال کیا۔ اس سلسلے میں روزنامہ زمیندار کے 24 اکتوبر 1931 پر دو دن قبل کا ''مگسی مہاجرین کا ٹیلیگرام'' شائع ہوا تھا، جو کہ وائسرائے اور وزیر ہند کے نام تھا:

''شاہ داد کوٹ۔ 22 اکتوبر۔ مظلوم و مفلس مگسی مہاجرین کی تعداد میں دن بدن اضافہ

ہو رہا ہے۔ جو لوگ یہاں آ گئے ہیں، وہ رہنے کے لیے جھونپڑے تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ وائسرائے بہادر سے ملاقات کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جب سے وزیر اعظم کلات کے مظالم کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی ہے، وہ پہلے سے بھی زیادہ سختی پر اُتر آئے ہیں۔ پولیٹیکل ایجنٹ اس کے اشاروں پر کام کر رہا ہے اور اُس سے کہہ کر اس نے معتبر و معزز آدمیوں کی گرفتاری کے وارنٹ حاصل کر لیے ہیں۔۔۔ بہادر گورنر جنرل کے ایجنٹ، پولیٹیکل ایجنٹ اور وزیرِ ہند کو تار روانہ کر دیا گیا ہے کہ وہ اس اہم معاملہ میں مداخلت کریں اور مہاجرین کو حکومتِ ہند تک اپنی شکایت پہنچانے کی اجازت دیں۔

''مولانا ظفر علی خان، حاجی عبداللہ ہارون، سید حبیب، ڈاکٹر عالم، خان عبدالغفار خان، ریاستی پرجا منڈل، انجمن بلوچاں۔۔۔ اور نواب رائے سینی سے بذریعہ تار درخواست کی گئی ہے کہ وہ بنفسِ نفیس یہاں تشریف لا کر مظلوم رعایا کی رہنمائی فرمائیں''۔

اُس نے اس کے علاوہ ایک ٹیلیگرام خانِ کلات کو بھی بھیجا: ''شمس شاہ اور مان سنگھ نے آپ کی رعایا کی زندگی اجیرن بنا رکھی ہے، انھیں برطرف کیا جائے''۔

دشمن بھی کیوں خاموش رہتا؟ شمس شاہ بھی اخبارات کو خوب استعمال کر رہا تھا۔ شمس شاہ نے خود کو پیچھے رکھ کر یوسف کے بھائی گل محمد کی طرف سے اخبارات میں بیان دلوائے کہ سوتیلا بھائی یوسف گویا اس کی سرداری کے خلاف سازشیں کر رہا ہے۔

میر عبدالعزیز کرد نے 1931 میں مگسی بلوچوں کی تحریکِ ہجرت میں سر شمس شاہ جیسے ایک مطلق العنان حاکم کے ظلم و ستم کے برخلاف احتجاج کے بطور ہیڈ ماسٹری کی باعزت ملازمت چھوڑ دی۔ اور نواب زادہ میر یوسف علی خان کے ساتھ ایک ایسے خطرناک اور پُر آشوب زمانے میں اشتراکِ عمل کیا جس میں شمس شاہ بڑے زوروں پر تھا، اور اس کے برخلاف ایسا اقدام کرنا آگ میں کودنا تھا۔ لیکن کُرد صاحب نے خدا پر توکل کر کے اس آگ میں سب سے پہلے کود کر بلوچستان کی عملی کارروائی کا افتتاح کیا اور سرزمینِ بے آئین بلوچستان میں اخباری پروپیگنڈا اور انجمنی طریقہ کار کا دروازہ کھولنے میں میر یوسف علی خان کے ساتھ مساویانہ حیثیت سے ایک تاریخی کارنامہ

انجام دیا۔(9)

جرگہ مگسی مہاجرین منعقدہ 22 دسمبر 1931 کے خطبہ صدارت میں مگسی نے کہا:

''میرے پہلو میں ایک حساس دل ہے اور اس میں درد ہے۔ میں اپنے بلوچ بھائیوں کو بلا تفریق ملک، انسانیت کے معراج اعلیٰ پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ ان کی موجودہ اقتصادی تعلیمی معاشرتی خامیاں مجھے بے قرار کیے رکھتی ہیں۔ میں اہلِ بلوچستان کو دیگر ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش چلتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے ہی میں نے اپنی زندگی وقف کر دی ہے''۔(10)

انھی ایام میں خان محمود خان بیمار ہو کر موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ خان کے چھوٹے بھائی خان اعظم جان نے میر فیض محمد شاہوانی کی وساطت سے جماعت سے رابطہ قائم کرتے ہوئے پیشکش کی کہ جماعت اگر ایمانداری سے اس کے خان بن جانے کی حمایت کرے تو برسر اقتدار آتے ہی وہ ریاست میں ذمہ دار حکومت قائم کرے گا۔

مذاکرات ہوئے، اور آخر کار اس کے ساتھ ریاست کلات میں جوابدہ حکومت قائم کرنے کی شرط مان لی۔ یوں انجمن اتحادِ بلوچاں نے محمود خاں کی جانشینی کے لیے محمد اعظم کی حمایت کا اعلان کر دیا۔

انجمن اتحادِ بلوچاں کے سرگرم اراکین میر یوسف علی خان مگسی، میر عبدالعزیز کرد، میر عبدالرحمان بگٹی، ملک فیض محمد یوسف زئی اور محمد حسین عنقا نے صرف تحریری پروپیگنڈہ پر اکتفا نہ کیا بلکہ بلوچستان کے اندر اور باہر سرداروں کو شہزادہ اعظم جان کے حق میں ہموار کرنے کے لیے دن رات محنت کی۔ کچھی کے سردار متزلزل تھے۔ جھالاوان کے سرداروں میں صرف رسول بخش مینگل اور رستم خان محمد حسنی انجمن کے ساتھ تھے۔ مشرق میں صرف مہراللہ خان مری اور مکران میں نواب بائی خان گچکی اعظم جان کے طرف دار تھے۔

محمود خان 38 سال دس ماہ حکمرانی کر کے 2 اور 3 نومبر 1931 کی درمیانی رات فوت ہو گیا۔

جب انگریزوں اور ان کے مقامی ریاستی ہم نواؤں کی طرف سے انور کے بطور خان کی

تقرری کے لیے تگ و دو زور پکڑ گئی تو جماعت نے شہزادہ میر اعظم خان کو خان مقرر کرنے کے لیے چند اور عملی اقدامات کیے تا آنکہ گوناگوں مخالفتوں کے باوجود سرداروں نے بھی حمایت کا اعلان کر دیا۔

چنانچہ دس دسمبر 1931 کو سردارانِ کلات، لسبیلہ، خاران اور مری نے مستنگ کے مقام پر خان کے بھائی محمد اعظم (1931-1933) کو خانِ کلات منتخب کر لیا۔

اس طرح خان اعظم جان نے انجمن کی حمایت سے کامیابی حاصل کی تھی اور اس کی انفرادیت یہ تھی کہ بلوچستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ وائسرائے ہند نے بہ نفسِ نفیس یہاں آ کر خان کی تاجپوشی کی۔

اعظم جان کے خان بننے سے حالات نے ایک نئی کروٹ لی۔ نئے خان نے شمس شاہ کو 1932 میں معطل کر دیا۔ اُس کی جگہ کسی خان بہادر گل محمد خان کو وزارتِ عظمیٰ سونپی گئی۔ قبائلی مسائل کی گرہ کشائی کے لیے نیا طریقہ اختیار کیا گیا اور ہجرت کردہ مگسیوں کو واپس بلایا گیا۔

یوں، یوسف اور اس کے ساتھیوں کی طویل جدوجہد کے نتیجے میں ایک بہت بڑے ڈکٹیٹر شمس شاہ سے عوام الناس کو نجات مل گئی۔ محمود خان ویسے ہی اجل کا مہمان بن چکا تھا۔

9۔ آل انڈیا بلوچ کانفرنس

(جیکب آباد)

(اس بارے میں ہمیں بے شمار لٹریچر ملا۔ اس قدر زیادہ مواد کہ ہم نے اس عنوان سے ایک الگ کتاب لکھی)۔

اس سیاسی پارٹی نے باقاعدہ طور پر 1932 میں اپنے وجود کا اعلان کیا۔ اور اُسی برس دسمبر کے آخر میں جیکب آباد میں اس کی چار روزہ تاسیسی کانگریس منعقد ہوئی تھی۔ ایک بھرپور تنظیمی ڈھانچے کے ساتھ اس تاسیسی کانفرنس نے مندرجہ ذیل موٹی موٹی قراردادیں منظور کی تھیں۔

* بلوچستان کے عوام اور انڈیا کی بلوچ قوم کی اخلاقی، تعلیمی سیاسی اور معاشی حالت

میں اصلاح کرنا اور ان میں تعاون، اتحاد اور بھائی چارے کے تعلقات قائم کرنے کے لیے تمام آئینی طریقے استعمال کرنا۔

* یہ کانفرنس سیاہ کاری کے اس رواج کو بنظرِ نفرت دیکھتی ہے جس کے ذریعہ سے سیہ کار مرد سے عوضانہ سیاہ کاری کے بطور اُس کی لڑکی یا بہن جبراً نکاح میں لی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ کانفرنس گورنمنٹ بلوچستان اور ریاستی کانفیڈریشن آف بلوچستان سے انسانیت کے مقدس نام پر اپیل کرتی ہے کہ آئندہ کسی معصوم لڑکی کو کسی فاحش آدمی کے جرائم کا شکار نہ بنایا جائے۔

* یہ کانفرنس آنریبل مسٹر کیٹر آئی سی ایس، سی آئی اے، ایجنٹ گورنر جنرل بلوچستان کا شکریہ ادا کرتی ہے جنہوں نے بلوچستان کی دردناک پسماندگی کو محسوس کرتے ہوئے ملکی آدمیوں کی ترقی پر خصوصی توجہ مبذول کر کے اپنے تدبر اور فراخدلی کا ایک بے نظیر ثبوت پیش کیا ہے۔

نیز یہ کانفرنس امید کرتی ہے کہ صاحبِ ممدوح دوسرے لوگوں کے خودغرضانہ پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر ملکی کارکنوں کے راستہ میں مشکلات پیدا نہیں کریں گے، بلکہ ان کی حوصلہ افزائی اور حق رسی فرماتے رہیں گے۔

* یہ کانفرنس گورنمنٹ سے استدعا کرتی ہے کہ بلوچستان میں قحبہ خانہ (چکلا) کو جو شرعاً اور اخلاقاً ایک سنگین اور مجرمانہ رواج ہے، بند کیا جائے۔

* یہ کانفرنس گورنمنٹ برٹش بلوچستان اور ریاستی کنفیڈریشن سے استدعا کرتی ہے کہ وہ اہلکاروں اور جرگہ کی راہنمائی کے لیے قانونِ رواج کو ایک کتابی صورت میں شائع کریں۔ اور اس کی تدوین اور ترمیم شرعِ انوری کی روشنی میں کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کریں، جس میں کم از کم 1/3 حصہ ایسے افراد کا شامل ہو جو شرعِ انوری سے کماحقہٗ واقفیت رکھتے ہوں اور مستند علما میں سے ہوں۔

* یہ کانفرنس رسمِ لب اور ولور کو نہایت ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اپنے

بلوچستان کے عوام سے امید کرتی ہے کہ اس حقیر و ذلیل رسم کو جتنی جلد ہو سکے منسوخ کر دیں اور گورنمنٹ سے امید رکھتی ہے کہ وہ اس مذموم رسم کی انسداد کی تدابیر جلد از جلد عمل میں لائے گی۔

* یہ کانفرنس گورنمنٹ برٹش بلوچستان اور ریاستی کنفیڈریشن آف بلوچستان سے التجا کرتی ہے کہ وہ مہربانی کر کے تعلیمِ نسواں کے کاز کی گرمجوشی سے مدد کریں، اور بلوچستان کے عوام سے درخواست کرتی ہے کہ وہ اس طرف خاص توجہ مبذول کرے۔

* یہ کانفرنس حکومت ہائے بلوچستان سے استدعا کرتی ہے کہ وہ عورتوں اور بیواؤں کو بطورِ ورثہ اشیائے خانگی کی طرح ایک شخص کی موت کے بعد اُس کے وارثوں کے حوالے کیے جانے کو قانوناً ممنوع قرار دے اور عورتوں کے حقوق زناشوئی، وراثت اور ترکہ بروئے شرعِ انوری قائم کیے جائیں۔

* یہ کانفرنس، قطع نظر اس کے کہ مقدمات کے واقعات کچھ ہوں، ہز ایکسیلنسی گورنر اِن کونسل بمبئی سے نہایت ادب کے ساتھ التجا کرتی ہے کہ ارادت مندانِ درگاہ پیر پگارو کی کثرت تعداد اور موجودہ گدی نشین کی کم سنی اور ناتجربہ کاری کو مدنظر رکھتے ہوئے جتنا ترحم کا سلوک اُن کے معاملہ میں کر سکتے ہیں، کریں۔

* یہ کانفرنس بلوچستان اور بالخصوص ریاستی کانفیڈریشن آف بلوچستان سے درخواست کرتی ہے کہ وہ مقدمات کے تصفیہ میں تعجیل سے کام لے۔ کیونکہ بہت سے مقدمات سالہا سال بلاضرورت زیرِ غور رہتے ہیں جس سے انصاف کا اصل مقصد و مفہوم فوت ہو جاتا ہے۔

* یہ کانفرنس حکامِ سندھ سے استدعا کرتی ہے کہ چونکہ سندھ میں کافی تعداد بلوچوں کی ہے اور بہ نسبت دیگر اقوام کے تعلیمی لحاظ سے بہت پست ہیں، اس لیے ان کی تعلیمی ترقی کے لیے خاص رعایت کی جائیں۔ سکولوں اور کالجوں میں انھیں خاص وظائف دیے جائیں۔

13۔ یہ کانفرنس ریاستہائے بلوچستان، سندھ اور پنجاب سے درخواست کرتی ہے کہ

بلوچوں کی اُن مذموم مراسم کو بند کرادے جس کی رو سے لڑکیوں کی نسبت (منگنی) اُن کی پیدائش سے قبل قرار پاتی ہے۔

* یہ کانفرنس کمشنر صاحب سندھ اور ایجوکیشنل انسپکٹر صاحب سے استدعا کرتی ہے کہ وہ کراچی کے مفلس اور بے کس مکرانی بلوچوں کی تعلیمی پستی کو مدنظر رکھتے ہوئے ''سپیشل محمڈن سکالر شپ''، کنگ ایڈوڈ میموریل سکالرشپ اور دیگر سرکاری تعلیمی وظائف میں سے مکرانی طلبا کو مکرانی بلوچوں کی تناسب آبادی سے حصہ دیں۔

* یہ کانفرنس دردمندانہ انداز میں حکامِ سندھ، بلوچستان اور ریاستی کنفیڈریشن آف بلوچستان سے درخواست کرتی ہے کہ موجودہ اقتصادی زبوں حالی کے پیشِ نظر مالیہ میں اس سال پچاس فیصدی رعایت کرے۔ نیز یہ مجلس گورنمنٹ سے عرض کرتی ہے کہ ''زمیندار'' فرقہ کی مالی امداد تقاویوں کی صورت میں کرے۔

* یہ کانفرنس گورنمنٹ سندھ سے درخواست کرتی ہے کہ جس طرح بلوچستان اور پنجاب میں غیر زراعت پیشہ اقوام کے ہاتھوں انتقالِ آب واراضی بند ہے، اسی طرح سندھ میں بھی یہ قانون نافذ کر کے سندھی زمینداروں کو تباہی سے بچائے۔

* یہ کانفرنس حکومتِ ہند سے گزارش کرتی ہے کہ فرنٹیئر ریگولیشن کا خاص قاعدہ جو بالائی سندھ کے باشندوں کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے، موجودہ ترقی یافتہ زمانہ میں غیر ضروری اور مضر ہے۔ باشندگانِ ضلع فائدے کے بدلے سخت نقصان اٹھا رہے ہیں۔ اس لیے اسے منسوخ فرمایا جائے۔ نیز یہ کانفرنس پُر زور الفاظ میں ممبرانِ اسمبلی خصوصاً حاجی عبداللہ ہارون و دیگر اصحاب سے اپیل کرتی ہے کہ وہ بھی اس ریگولیشن کو منسوخ کرانے کی طرف توجہ کریں۔

* یہ کانفرنس گورنمنٹ بلوچستان سے درخواست کرتی ہے کہ پولیس اور ملیشیا کی بھرتی خاص اصل ملکی لوگوں کے لیے مخصوص ہو۔

* یہ کانفرنس حکومتِ ہند سے استدعا کرتی ہے کہ بلوچ رجمنٹس میں بلوچ اور بلوچستانیوں کی بھرتی ازسرِ نو شروع کی جائے۔

* قیامِ امن اور فروغِ تعلیم وصنعت وغیرہ کے لیے بلوچستان اور بلوچ آبادی رکھنے والے ہر ضلع میں کم از کم ایک صد کارکن بھرتی کیے جائیں جن کا سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ وہ صرف سوشل اور مذہبی رسوم کی اصلاح کے لیے کام کریں۔

لہٰذا یہ اجلاس قومی کارکنوں سے درخواست کرتا ہے اور انھیں خاص ہدایات دیتا ہے کہ رضا کاروں کے انتخاب میں خاص طور پہ خیال رکھیں کہ رضا کار شرابی نہ ہو، جھوٹ نہ بولتا ہو، لڑائی جھگڑا کرنے والا نہ ہو اور نہایت مخلص اور نیاز مندانہ طریق پر سوشل اور مذہبی اصلاحات کے لیے جدوجہد کر سکتا ہو۔

یہ اجلاس گورنمنٹ سے درخواست کرتا ہے کہ اس سلسلے میں گورنمنٹ ہمارے کارکنوں کو ہر طرح سے مراعات دے کر ہمارے مقاصد میں ہماری مدد کرے، تاکہ موجودہ خانہ جنگیوں کا انسداد کر کے بلوچستان کو اللہ کی فرماں بردار قوم اور گورنمنٹ کی امن پسند رعایا ثابت کرے۔

* یہ کانفرنس گورنمنٹ آف انڈیا سے استدعا کرتی ہے کہ وہ حدودِ بلوچستان کے اندر ریلوے، پوسٹ، ٹیلیگراف اور دیگر محکمہ جات کو جن کا تعلق براہِ راست گورنمنٹ آف انڈیا سے ہے یا تو بلوچستان کی حکومت کے ماتحت کر دے یا ہمارے حقوق کی حفاظت کا خاص خیال رکھے۔

* یہ کانفرنس گورنمنٹ سے استدعا کرتی ہے کہ اگرچہ بلوچستان میں کسی غیر ملکی یا غیر زراعت پیشہ افراد کو انتقالِ اراضی کو قانوناً ممنوع قرار دیا گیا ہے لیکن پھر بھی درحقیقت اس پر عملدرآمد نہیں کیا جا رہا۔ یہ کانفرنس گورنمنٹ سے اپیل کرتی ہے کہ اس قانون کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ نیز Minors Act پہ بھی جس پر بھی عمل درآمد نہیں ہو رہا۔

* بلوچستان اینڈ آل انڈیا بلوچ کانفرنس کا یہ اجلاس مطالبہ کرتا ہے کہ بلوچستان میں ایک علیحدہ گورنری صوبہ کی حیثیت سے آئینی حکومت کا نفاذ کیا جائے جس کو اپنے داخلی نظام میں مکمل

آزادی حاصل ہو اور ڈیرہ غازی خان اور بالائی سندھ کے سرحدی اضلاع جن میں بلوچ نمایاں ہیں، کو بلوچستان میں شامل کیا جائے۔

* یہ کانفرنس گورنمنٹ بلوچستان سے استدعا کرتی ہے کہ بلوچستان کے محکمہ جات میں اصل ملکی باشندگان کو ان کی آبادی کے لحاظ سے نوکریاں دی جائیں۔ اور باہر کے لوگوں کی خواہ باتنخواہ یا بلاتنخواہ تعیناتی مکمل طور پر بند کر دی جائے۔ اور اعلیٰ ملازمتوں کی نشستوں کو پُر کرنے کے لیے ملکیوں کو ترقی دے کر اُن کے تناسب کو جلد از جلد پورا کیا جائے۔ نیز اعلیٰ تعلیم یافتہ اصلی ملکیوں کو براہِ راست اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیا جائے، جس طرح باقی صوبہ جات میں ہوتا ہے۔

* یہ کانفرنس حکومتِ بلوچستان وریاستی کنفیڈریشن آف بلوچستان سے استدعا کرتی ہے کہ بلوچوں میں تعلیم پھیلانے کے لیے جلد از جلد مندرجہ ذیل تجاویز پہ عملی جامہ پہنایا جائے۔

(الف)۔ محکمہ تعلیم ملکی افسرانِ تعلیم کے سپرد ہو۔ اس لیے از حد ضروری ہے کہ موجودہ سپرنٹنڈنٹ کی ریٹائرمنٹ کے بعد ملکی سپرنٹنڈنٹ مقرر ہو۔ لیکن موجودہ انسپکٹروں کی جگہ فی الفور ملکی انسپکٹر مقرر کیے جائے۔

(ب)۔ پرائمری تعلیم کو بلوچستان میں ضروری اور لازمی قرار دیا جائے۔ اور اس غرض کے حصول کے لیے دیہات میں کافی تعداد میں پرائمری سکول کھولے جائیں اور سکول کھولنے کی شرط 20 سے گھٹا کر 10 طلبا کی جائے۔

(ج)۔ برٹش بلوچستان کی ہر تحصیل اور ریاستوں کے ہر ''نیابت'' میں ایک مڈل سکول قائم کیا جائے اور سردارانِ قوم پر زور دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں سکول کھولیں اور غریب لڑکوں کے لیے وظائف مقرر کریں۔

(د)۔ ہر مڈل سکول کے ساتھ ایک بورڈنگ ہاؤس قائم کیا جائے۔

(ر)۔ بلوچستان کے ہر ضلع میں ایک ٹیکنیکل سکول قائم کیا جائے جس میں ملکی دستکاری اور صنعت وحرفت سکھائی جائے تا کہ طلبہ کے لیے ذریعہِ معاش بھی بن سکے۔

(س)۔ سکول اور کالج کی تعلیم کے موجودہ وظائف صرف بلوچستان کے اصل ملکی طلبہ کے لیے مخصوص کر دیے جائیں اور ان وظائف کی تعداد بھی بڑھائی جائے۔

(ص)۔ بلوچستان کو انٹرنس ایگزامینگ یونیورسٹی بنایا جائے تا کہ ملکی لوگ نصاب تعلیم میں خاطر خواہ ترمیم کر سکیں۔

(ط)۔ سکولوں کے وظائف خاص طور پر غریب ملکی طلبہ کو دیے جائیں اور دولت مند سرداروں اور معتبرانِ قوم کے لڑکوں کو قطعاً نہ دیے جائیں۔

* یہ کانفرنس حکومتِ بلوچستان سے استدعا کرتی ہے کہ آئندہ کوئٹہ میونسپلٹی میں آزاد انتخاب کے ذریعہ ممبر لیے جائیں۔

* یہ کانفرنس ڈسٹرکٹ بورڈ مظفر گڑھ سے مطالبہ کرتی ہے کہ سردار کوڑا خان مرحوم جتوئی بلوچ کی جائیدادِ متروکہ سے جو وظائف سکولوں اور کالجوں کے طلبا کے لیے مقرر ہیں، اور زمانہ حال تک بلوچوں ہی کو ان کی تعلیمی پستی کو ملحوظِ خاطر رکھ کر ملتے رہے ہیں اور اب کسی نامعلوم وجہ سے وہ غیر بلوچوں کو ملنے شروع ہو گئے ہیں، حالانکہ بلوچوں کی تعلیمی پستی ہمچوں سابق موجود ہے۔ اس لیے اشد ضروری ہے کہ سابقہ قوائد جس کی رو سے بلوچوں کا حق وظیفہ لینے کا رائج تھا، بحال کیے جائیں۔

* بلوچستان کے لوگوں کی اکثریت کا گزر بسر اُن کی بھیڑوں کے ریوڑوں پر ہوتا ہے جو صرف بلوچستان میں چرائے جاتے ہیں۔ چونکہ غیر ملکی بالخصوص پاوندوں کو بلوچستان میں داخلے پر کوئی پابندی نہیں ہے، اس لیے وہ اپنی بھیڑوں اور گائے بیلوں کے ریوڑوں کو بلوچستان کی بہترین چراگاہوں میں چراتے ہیں۔ اُن پہ مال چرائی کا ٹیکس نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ کانفرنس حکومتِ بلوچستان سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اِس ملک میں اُن کے داخلے کو ہمیشہ کے لیے بند کرے۔

***

(بقول انعام الحق کوثر ''اس کانفرنس کے آخری اجلاس میں یوسف عزیز مگسی کی یہ نظم

پڑھی گئی: (اور بقول انعام الحق کوثر، بلبلانِ خلافت نے یہ قومی ترانہ پڑھا تھا)۔

میں اگر چاہوں تو ذرے کو بیاباں کر دوں
قطرۂ آب میں پیدا سرِ طوفاں کر دوں
یہ ارادہ ہے کہ اسلام کا خادم بن کر
ساری دنیا کو نئے سرے سے مسلماں کر دوں
پھر وہی بھولا سبق یاد دلاؤں سب کو
ہر بلوچی کو غرض عاملِ قرآں کر دوں
جی میں آتا ہے کہ پھر طور کو آباد کروں
آتشِ دل سے پہاڑوں میں چراغاں کر دوں
گاندھی و مالوی کے وعظ دھرے رہ جائیں
میں اگر قولِ محمدؐ کو نمایاں کر دوں
جوش میں آ کے اگر نعرۂ اللہ ماروں
حق و باطل کے تفاوت کو نمایاں کر دوں
میں وہ مجنوں ہوں اگر چاہوں جہاں کو یکسر
طرۂ یار کی مانند پریشاں کر دوں
اس قدر شعلہ فشاں بزمِ جہاں میں ہو جاؤں
ذرے ذرے میں بپا حشر کا ساماں کر دوں
میں وہ مالی ہوں، اگر کھول دوں دل کی سوتیں
خشک صحراؤں میں پیدا گل و ریحاں کر دوں
اسی ایقانِ براہیم کا وارث ہوں عزیزؔ
اب بھی آتش کو اگر چاہوں گلستاں کر دوں

ظاہر ہے کہ یوسف مگسی ہی اس پوری تحریک کا روحِ رواں تھا۔ پھرکی کی طرح متحرک، پیسہ چندہ اکٹھا کرنے، دعوت نامے بانٹنے، مہمانداری، اور انتظامات کرنے، مسودات کی تیاری۔۔۔۔سب کچھ اسی نے سنبھالا تھا۔ یوسف، بلوچستان پہ خدا کی نعمت تھا۔

کانفرنس کے بانیوں اور منتظمین نے اس کے سیاسی نکات کو بنیاد بنا کر اپنی سرگرمیاں دکھائیں۔ اس سلسلے میں بلوچستان آرکائیوز میں یوسف عزیز مگسی کے بطور نائب صدر آل انڈیا بلوچ کانفرنس ایک مضمون خصوصی اہمیت کا حامل ہے جو 31 جنوری 1933 میں ایسٹرن ٹائمز میں چھپا تھا۔ عنوان تھا: ریفارمز اِن بلوچستان۔ (ترجمے کی خامیاں میری ہیں۔ مصنف)

''سرکاری ریشہ دوانی اور بیوروکریٹک بالادستی کے اِن دنوں میں، بلوچستان اینڈ آل انڈیا بلوچ کانفرنس کی کمال کامیابی نہ صرف میرے اور مجھ جیسے طرزِ تفکر رکھنے والے لوگوں کے لیے خوشی اور اطمینان کی بات ہے بلکہ انڈیا کے دوسرے حصوں میں رہنے والے ہمدرد بھائیوں کے لیے بھی، جو شروع سے بلوچ معاملات میں گہری دلچسپی لیتے رہے ہیں۔

''میں پریس کے اُس حصے سے اپنی ممنونیت اور احسان مندی کا اظہار نہ کروں تو اپنے فرض میں ناکام رہوں گا جس نے رضا کارانہ طور پر بلوچستان کے کاز کی مدد کی ہے۔ میں بھرپور زور اور اخلاص سے کہتا ہوں کہ میں یہ کہنے کا اختیار رکھتا ہوں کہ بلوچستان کے عوام اُن کی خدمات اور مدد کو بہت سراہتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ وہ ترقی کرنے کے اُن کے کاز کی مدد کرنے اور مشتہر کرنے میں آخر تک ساتھ دیں گے۔

''بلوچستان اینڈ آل انڈیا بلوچ کانفرنس نے پورے اتفاق سے بلوچستان کے اندر ریگولر اور مساوی آئینی اصلاحات نافذ کرنے کی اہم قرارداد منظور کی۔ قراردادوں کی کاپیاں فوری طور پر وزیرِ اعظم، سیکریٹری آف سٹیٹ فار انڈیا، سر آغا خان اور RTC کے مسلمان مندوبین کو بذریعہ ٹیلیگرام بھیج دی گئی تھیں۔ اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ آیا بلوچستان ایک اصلاح یافتہ اور خود مختار صوبے کے بطور ضروری اور بنیادی مالیاتی وسائل رکھتا ہے؟۔ میں بھرپور رائے رکھتا ہوں کہ اس طرح کا

اعتراض مزید ترقی اور فطری بڑھوتری کے امکانات اور یقینی امروں بھرے ایک صوبے تو کیا کسی بھی قصبے، ملک اور حتیٰ کہ ایک قصبہ کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اسے ہونا چاہیے۔۔۔ ذریعہ، انجام نہیں ہے بلکہ انجام اصل مقصد ہے۔ اِس نکتے پر میں اسی بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ بلوچستان کے موجودہ اخراجات واقعی حد سے بڑھ کر ہیں۔ مجھے مکمل یقین ہے کہ بلوچستان حال کی بہ نسبت اپنے مستقبل کی باوقار پوزیشن کو ایک زیادہ میانہ رو، اور مناسب اخراجات سے برقرار رکھے گا۔ حال کے اخراجات کے پیمانے کو بلوچستان کی آئینی ترقی کے لیے ایک رکاوٹ سمجھنا بہت نامناسب ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ عوام اور حکومت کے سامنے ہمارے پاس بہت سی تجاویز ہیں جنہیں بہت جلد سامنے لایا جائے گا۔

''دوسرا اعتراض جو کچھ حلقوں میں بے چینی پیدا کر رہا ہے، یہ ہے: برٹش بلوچستان کی آبادی کم ہے اور بلوچستان کے بقیہ حصے ریاستوں اور قبائلی سربراہوں میں منقسم ہیں، لہٰذا اِن بظاہر آزاد ریاستوں میں کسی طرح کا ریگولر حکومتی نظام نافذ کرنا بہت مشکل ہوگا۔ پہلا اعتراض فریبی بہانوں کے ذریعے بنیادی حقوق کے ایک فنکارانہ انکار سے زیادہ کچھ نہیں۔ ہر ذی شعور شخص اس اعتراض کو فوری طور پر مسترد کر دے گا۔ اس لیے کہ جھوٹے بہانوں اور کمزور بنیادوں پر ساری قوم کو اُس کے پیدائشی حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے اعتراض میں بھی آفیشل بلاک کے اُس بار بار دہرائے جانے والے بہانے کے ساتھ اُسی طرح کی ایک نمایاں یکسانیت ہے کہ جب تک ہندوستانی ریاستیں ہندوستان کی آزادی کے مطالبے کے لیے ہم آواز نہیں ہوتیں، کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ سر محمد اقبال نے حال ہی میں بلوچستان کے لیے اصلاحات کے معاملے پر بحث کرتے ہوئے رائے دی کہ ''برٹش بلوچستان، قلات اور لسبیلہ ریاستوں کو ایک کیا جانا چاہیے، یا انھیں ایک فیڈریشن میں بدلنا چاہیے، اور اس فیڈریشن کو آل انڈیا فیڈریشن کی ایک فیڈرل یونین بننا چاہیے''۔ اس تجویز نے اچھی خاصی توجہ حاصل کی اور میرے خیال میں یہ اب تک اِس معاملے میں پیش کی گئی سب سے بہترین تجویز ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر قبائلی سربراہوں کے مفاد کی حیثیت کو تحفظ دیا جائے اور اُن کی داخلی آزادی محفوظ ہو تو انھیں بلوچ فیڈریشن میں شامل ہونے میں کوئی اعتراض

نہ ہوگا۔ میں کلات اور لسبیلہ کے حکمرانوں سے پوچھنے کی رعایت لیتا ہوں: کیا وہ براہِ راست آل انڈیا فیڈریشن میں شامل ہونے کے بجائے بلوچ فیڈریشن میں شمولیت کو ترجیح نہ دیں گے؟۔

'سیاست' لاہور کے سید حبیب نے ابھی حال ہی میں جیکب آباد کا دورہ کیا، اور گفتگو کے دوران کہا: ''برٹش بلوچستان کے لیے اصلاحات کا مطالبہ کرنا اس علاقے کو اوریجنل حقوق سے محروم کرنے کے مترادف ہے، جس کی نیک نیتی شک شبہ سے بالا ہے اس لیے کہ کوئٹہ، چاغی، بولان اور نصیر آباد اصل میں ریاست کلات سے تعلق رکھتے ہیں اور برطانوی حکومت اصل حکمران نہیں ہے، بلکہ وہ اس علاقے کے معاملات کو چلانے کے لیے محض ایک لیز ہولڈر ہے''۔ اس لیے اصلاحات کا مطالبہ کرنے کا مطلب یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ علاقہ برطانوی حکومت کا ہے۔

''سید صاحب نے زور دے کر تجویز دی کہ ''بلوچ کانفرنس کلات سٹیٹ کی طرف سے علاقے کو دوبارہ قبضہ کرنے کی بات کرے اور پھر کلات سٹیٹ سے آئینی اصلاحات دینے کا مطالبہ کرے''۔ یہ تجویز واقعی اہم ہے مگر وقت کی کمی کی وجہ سے کانفرنس میں اس پر غور نہ کیا گیا۔ میرا خیال ہے کہ اس تصور کو کلات کے حکام کی بھی حمایت حاصل ہے۔ مگر مجھے اندیشہ ہے کہ مطالبہ اصلاحات کو ملتوی کرے گا جو کہ قریب ترین مقصد ہیں اور جب تک تجویز کے پیچھے کوئی قاعدہ قانون نہیں، سید حبیب کا مطالبہ ایک طرح سے ناقابلِ عمل اور تصوراتی رہے گا۔ لہٰذا، میں بلوچوں سے اپیل کروں گا کہ وہ برٹش بلوچستان اور بلوچ ریاست کے لیے ایک بلوچ فیڈریشن اور بلوچستان کے لیے مساوی اصلاحات پر اپنی سرگرمیاں مرکوز رکھیں۔

''آخر میں میں برطانوی حکومت سے اپیل کروں گا کہ وہ اُن آئینی اصلاحات میں تاخیر نہ کرے جن پر کہ آل انڈیا بلوچ کانفرنس متفق ہوئی۔ اگر برطانوی حکومت بلوچوں پہ شک اور غلط فہمی کو مٹانے کی خواہش مند ہے، تو یہی وہ وقت ہے کہ آگے بڑھا جائے۔ میں لوکل گورنمنٹ سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ آل انڈیا بلوچ کانفرنس کی تجویز کے مطابق ایک کمیٹی بنائے جو کہ جرگہ کی راہنمائی کے لیے سارے رسمی اور روایتی قوانین کو کتابی صورت میں مرتب کرے۔ بلوچستان اینڈ آل انڈیا بلوچ کانفرنس نے تعلیمی ترقی کے معاملے پر کافی توجہ دی ہے۔ کانفرنس متفقہ طور پر راضی

ہوئی ہے کہ حکومت سے کوئٹہ میں ایک ڈگری کالج کھولنے کا مطالبہ کیا جائے اور ہر قصبہ اور گاؤں میں سکول کھولے جائیں۔ لوکل گورنمنٹ اس خواہش کی تکمیل کے لیے مناسب اقدامات کرے۔ میرا خیال ہے کہ فوری طور پر پرائمری تعلیم کو لازمی بنانے کا اعلان کیا جائے۔ میں امید کرتا ہوں کہ بلوچستان کی لوکل گورنمنٹ تعلیم کے معاملے میں دلچسپی لے گی۔ بلوچستان وجود کی جدوجہد میں انڈیا کے سارے صوبوں کے ساتھ آگے بڑھنے میں بہت مصمم ہے اور ایک لمحے کے لیے بھی اپنی تعلیمی اور سیاسی پسماندگی برداشت نہیں کرسکتا جو کہ قومی افتخار اور سیلف ریسپیکٹ کے خلاف ہے''۔

*****

یہ گواہی ہر مؤرخ دے گا کہ بلوچ کانفرنس کے زعما نے مگسی صاحب کے اِس مضمون کو اپنا منشور بنائے رکھا۔ بلوچ کانفرنس تو کیا، میرا دعوی ہے کہ آج ایک سو برس گزرنے کے بعد بھی یہاں کی عوامی پارٹی اپنی پوری سیاست اسی مضمون کے مندرجات پہ استوار کرے گی۔

*****

انگریز اور کلات حکومتیں مل کر بلوچ کانفرنس کے رہنماؤں کو گرفتار، اور جرمانہ کرنے، ملازمتوں سے برطرف کرنے اور اُن کے تبادلے کرنے میں لگ گئیں۔ اِن آمرانہ اقدامات کے خلاف جمہوری لوگوں کا ردِعمل آپ پچھلے صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔ بلوچستان کے یہ لیڈر صرف انگریز اور خان کے عوام دشمن اقدامات کی مذمت ہی نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ جمہوری سرگرمیوں میں مزید تیزی لا کر ان اقدامات کا جواب بھی دے رہے تھے۔ مثلاً سبی پولیس نے پولیٹیکل ایجنٹ سبی کو 3 فروری 1933ء کو ایک میمورنڈم میں روزنامہ زمیندار کی ایک خبر کے بارے میں اطلاع دی۔ جس کے تحت عید کے دن یوسف عزیز مگسی نے شہداد کوٹ میں دو تقریریں تھیں۔ ایک عید نماز پر اور ایک اُسی دوپہر کو۔ دونوں تقریروں کا خلاصہ یہ تھا کہ بلوچ قوم کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے نوجوانوں کو متحدہ کوششیں کرنی چاہئیں۔

ایک دلچسپ انکشاف یہاں یہ کیا گیا کہ''..... چنانچہ شہداد کوٹ میں ایک ینگ مینز ایسوسی ایشن قائم کی گئی یوسف علی اُس کا پہلا صدر بنا''۔ (اس YMA کا بعد میں کیا بنا، معلوم نہیں)۔

اسی طرح بلوچ کانفرنس سے وابستہ لوگ تحریر میں بھی مخالفین کا خوب خوب بھانڈا پھوڑ رہے تھے۔ اور وہ یہ کام بروقت، برمحل اور برجستہ طور پر کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں ہمیں بلوچستان آرکائیوز کے یوسف مگسی سے متعلق فائل میں انگریز کا ایک جاسوسی مراسلہ ملا جس میں ماتحت نے اپنے افسر کو روزنامہ زمیندار 5 فروری 1933 کے ایڈیٹوریل کالم میں شائع شدہ ایک مضمون کا انگریزی میں ترجمہ کر کے بھیجا۔ اس ترجمہ کو ہمیں پھر اردو میں ڈھالنا پڑا ہے۔ مضمون کا نام ہے: **زمین جنبد نہ جنبد گل محمد**:

''ضرب المثل ہے کہ ایک عقل مند دشمن، ایک احمق دوست سے بہتر ہے۔ انگریز لوگ جو سمندر پار سے آئے، براعظم ہند کے 35 کروڑ لوگوں کی تقدیروں کو کنٹرول کرتے ہیں، اور وہ مندرجہ بالا محاورے کے فلسفے سے خوب واقف ہیں۔ یہ درست ہے کہ کبھی کبھار وہ اپنے سامراجی مقاصد کی خاطر اپنے احمق دوستوں کو آلہ کار بنانے سے نہیں جھجکتے، اور وہ دوست اس قدر احمق ہیں کہ یقین کر لیتے ہیں کہ اِس ملک کے اعزاز یافتہ اور خالی الذہن لالچی لوگوں کی کونسل، برطانوی حکومت کا سنگِ بنیاد ہے۔ انگریز جو کہ حکمرانی کے قانون میں ماہر ہیں ان خوشامدی اشخاص سے کبھی خوش نہیں ہیں اور اپنے مقاصد حاصل کرنے کے بعد انھیں ٹھڈے مار کر نکال باہر کر دیتے ہیں۔

''انڈین گورنمنٹ کے ایسے احمق دوستوں میں'' کے بی گل محمد'' کا خاص مقام ہے۔ تقدیر نے اُسے ریاستِ کلات (بلوچستان) کی وزارت عطا کی ہے، اور اس نے بجائے اس کے کہ ریاست کے اصل مفادات کے تحفظ (جس کے ذریعے تعلیم لازمی اور عام ہو جاتی' زراعت کی حوصلہ افزائی ہوتی، تجارت بڑھتی، اور، رعایا خوش حال ہوتی) کرنے کے لیے اس اعلیٰ عہدے کو ذریعہ بناتا، وہ اپنی شرم ناک کوششوں کے ذریعے اُن صحیح سوچنے والے لوگوں کے بارے میں اعلیٰ حکام کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گیا، جن کا واحد جرم یہ ہے کہ وہ زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کی خواہش رکھتے ہیں، اور اپنے صوبے کے لیے وہی مقام حاصل کرنے کا مصمم ارادہ کر چکے ہیں جو کہ نئے آئین کے اندر دوسرے صوبے حاصل کر چکے ہیں۔

''جیکب آباد کی بلوچ کانفرنس نے کچھ قراردادیں صرف ایجوکیشن اور بلوچوں کی سماجی

ومعاشی ترقی کے لیے منظور کیں۔ سیاست میں انھوں نے معتدل اصلاحات کا مطالبہ کیا۔ مگر یہاں کے بی گل محمد خان اور اس کے کچھ دوستوں نے خود کو باور کرانے پر مجبور کیا کہ اس کانفرنس میں انقلاب کے جراثیم پوشیدہ تھے۔ وہ یہ ثابت کرنے کے لیے اپنا پورا زور لگا رہے ہیں کہ کچھ قومی کارکن برطانوی حکومت کے 'بدخواہ' ہیں اور لہٰذا اپنے لیے نئے اعزازات اور عہدے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ برطانوی حکمرانوں کے ساتھ خواہ ہم جو بھی سیاسی امور میں اختلافات رکھتے ہوں۔ پھر بھی ہم انھیں عقل اور جمہوریت سے اس قدر محروم نہیں سمجھتے کہ وہ کے بی گل محمد خان جیسے جدی پشتی بھکاریوں کی بکواس سے گمراہ ہوں گے۔

''ہم کے بی کو اس طرح کی بلاجواز وفاداری کرنے سے باز رہنے کے لیے خبردار کرتے ہیں، اور بلوچستان کے گونگے مسلمانوں پر ترس کھانے کا کہتے ہیں۔ بصورتِ دیگر ہم رازوں کو افشا کرنے پہ مجبور ہوں گے جو یقیناً اس کے مستقبل کی امیدوں پر پانی پھیر دیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ مضمون گل محمد کی پالیسی میں تبدیلی لائے گا اور یہ کہ اس تکلیف دِہ موضوع پر دوبارہ آنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ بلوچستان میں اے جی جی سے بھی درخواست ہے کہ وہ اپنی آنکھیں اور کان کھلی رکھے۔ اور جب تک وہ خود سنے یا دیکھے نہیں اُس وقت تک چاپلوس اشخاص کی بکواسیات سے متاثر نہ ہو۔

''آخر میں ہم اُن اشخاص کو بتا دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں، جو کہ قوم کو جگانے کے لیے اور اس کی تعلیمی اور معاشی بڑھوتری کے لیے اپنا پیسہ اور وقت فراوانی سے خرچ کر رہے ہیں، کہ وہ توانائی کے ساتھ اس متبرک کام کو جاری رکھیں، جو انھوں نے اس یقین کے ساتھ شروع کر رکھا ہے کہ انڈیا کے سارے مسلمانوں کی دعائیں اُن کے ساتھ ہیں''۔

بلوچ لیڈروں نے تقریروں تحریروں اور مذمتی قراردادوں کے علاوہ حکومتی تادیبی کاروائیوں کا اس طرح بھی جواب دیا کہ انھوں نے اپنے عوام سے مسلسل مضبوط روابط رکھے۔ لوگوں سے انفرادی اور وفود کی شکل میں ملاقاتیں کیں۔ عام قبائلی معاملات بھی ہوں تو انھیں وسعت دے کر قومی اور سیاسی موضوعات میں بدل دینے کی کوششیں کیں۔ چنانچہ انگریز کی جاسوسی رپورٹوں میں

تذکرہ ہے کہ ''نواب زادہ یوسف علی خان اپنے ملازم محمد سما ولد احمد علی راجپوت آف گجرانوالہ پنجاب، کے ہمراہ دوفروری 1933 کو جیکب آباد سے سبی پہنچا۔ اور اُس کا ارادہ دو ہفتے تک رہنے کا ہے''۔

ایک اور رپورٹ میں سبی سے اس کی واپسی 27 فروری کو ہوئی۔ یعنی وہ 25 دن سبی ٹھہرا۔

یوسف عزیز کی سبی میں موجودگی کا مقصد محض لوگوں سے میل ملاقات نہ تھا۔ سبی کا تو ویسے بھی بلوچ سیاست میں اہم مقام رہا ہے۔ سردیوں میں تقریباً سارا بلوچستانی دانش ور، سیاست دان، اور سردار یہاں ڈیرہ ڈالے رہتے ہیں۔ میلہ مویشیاں میں تو لائیوسٹاک اور زراعت سے وابستہ لوگ بھی یہیں کا رخ کرتے ہیں۔ یوں یہ شہر موسم سرما کے دو تین مہینوں تک سیاسی، سماجی اور معاشی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہتا ہے۔

یوسف مگسی کے طویل قیامِ سبی کے دوران پارٹی (بلوچ کانفرنس) نے اپنی ورکنگ (مرکزی) کمیٹی کا اجلاس یہاں منعقد کیا۔ یہ اجلاس 8 فروری 1933 کو رات کے گیارہ بجے سبی میں اُس کے بنگلہ پر ہوا جہاں آل انڈیا بلوچ کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا نائب صدر نواب زادہ میر یوسف علی خان ٹھہرا ہوا تھا۔ آل انڈیا بلوچ کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کی صدارت اُس کے چیرمین خان عبدالصمد خان اچک زئی نے کی۔

اور مندرجہ ذیل قراردادیں پیش ہوئیں۔

1- بلوچستان اینڈ آل انڈیا بلوچ کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا یہ اجلاس سیٹھ عبداللہ ہارون ایم۔ ایل۔ اے کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ انھوں نے مرکزی حکومت کی توجہ کانفرنس کی منظور کردہ تجاویز اور بلوچستان کے فطری حقوق کی طرف مبذول کرائی۔ اور امید کرتا ہے کہ وہ آئندہ بھی اسی طرح بلوچستان کی نمائندگی کرتے رہیں گے۔

2- بلوچستان اینڈ آل انڈیا بلوچ کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا یہ اجلاس پنجاب کے مسلم روزنامہ ''سیاست'' کے اس طرزِ عمل کو جو اس نے کانفرنس کے عام مفاد کے خلاف اور قومی کارکنوں خصوصاً ہمارے محترم نواب زادہ میر یوسف علی خان کی بے جا مذمت میں اختیار کیا ہے، نفرت کی نگاہ سے

دیکھتا ہے اور امید کرتا ہے کہ پنجاب کے قومی جرائد مدیر ''سیاست'' کو آئندہ ان ناجائز اور غیر ذمہ دارانہ اقدامات سے باز رہنے کی تلقین فرمائیں گے۔

3- کانفرنس کی منظور کردہ تجاویز متعلقہ اصلاحاتِ معاشرہ، تعلیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ورکنگ کمیٹی کا اجلاس سرداران ونوابانِ بلوچستان سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اس تعمیری واصلاحی فرض کو اپنے ذمہ لے کر ان کی ترویج وتبلیغ کی ہر ممکن کوشش کریں اور بلوچی کی لاج رکھیں۔ نیز یہ اجلاس ان کو یقین دلاتا ہے کہ اس کارِ خیر میں ورکنگ کمیٹی کے تمام مقامی ارکان ہر وقت ان کا ہاتھ بٹانے کے لیے مستعد اور تیار ہوں گے۔

4- بلوچستان اینڈ آل انڈیا بلوچ کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا یہ اجلاس بلوچستان کے ان سرداروں اور نوابوں کا شکریہ ادا کرتا ہے جنھوں نے اس قومی تحریک کے مفید ہونے کو تسلیم کرتے ہوئے ہمارے اصلاحی اقدامات میں ہمیں اپنی اعانت وحمایت کا یقین دلایا''۔

10۔ یوسف سردار بنتا ہے

یوسف علی عزیز مگسی کے سردار بننے کی بات بھی عجب ہے۔ اچھا ہوا کہ بلوچستان آرکائیوز کے خزانے میں سے مجھے یہ ٹکڑا مل گیا۔ ورنہ یہاں سے آگے والی اُس کی زندگی کے بارے میں لکھنے میں مجھے بہت دشواری ہوتی۔ آپ بھی اُس خفیہ رپورٹ کو پڑھیں جو چھوٹے اہلکار نے اپنے افسر کو بھیجی تھی۔ اس خفیہ رپورٹ کے مطابق؛ ''28 مارچ 1933 مگسی صاحب جب کوئٹہ میں تھا تو اس نے اپنے ایک تحریکی ساتھی بلدیو کو بتایا کہ پی اے قلات اور ریاست کلات حکام چاہتے ہیں کہ اگر میں لکھ کر دوں کہ میں کسی سیاست میں حصہ نہیں لوں گا تو وہ مجھے قبیلے کا نواب بنا دیں گے''۔

مگسی عوام گل محمد کی سرداری سے بغاوت کر بیٹھے تھے۔ لہٰذا یہ بات پکی تھی کہ گل محمد، سردار نہیں رہ سکتا۔ اب یا تو یوسف خانِ کلات کی شرائط مانتا وگرنہ سرداری اُس خاندان سے باہر نکل جاتی۔ اور اگر وہ خان کی شرائط مانتا تو اُسے خدشہ تھا کہ اتنی جانفشانی اور محنت سے جو عوامی بہبود کا پودا لگایا تھا، برباد نہ ہو جائے۔

ظاہر ہے اسے اِس امید پہ ثانی الذکر آپشن قبول کرنا پڑا کہ وہ کسی نہ کسی طور اپنی سیاست کو بھی جاری رکھ پائے گا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کوئی تحریر تو ہمیں اِس سلسلے میں نہ ملی لیکن اسی طرح کے بالواسطہ بہت سارے شواہد موجود ہیں کہ یوسف عزیز مگسی نے اپنے قبیلے سے باہر کی سیاست سے دور رہنے کی یقین دہانی بہر حال کرائی تھی۔

اس کا ایک ثبوت تو ہمیں اُسی سال کے اواخر کا ملا جب انگریز نے ایک خط میں باقاعدہ طور پر یوسف عزیز سے شکایت کی تھی۔ یہ شکایتی خط انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کلات نے 23 دسمبر 1933 کو یوسف کے نام لکھا جس میں اس معاہدے کا تذکرہ کیا؛ ''جب آپ کو سردار مقرر کیا گیا تھا تو آپ نے ہز ہائی نس مرحوم خان (اعظم خان) کو قول دیا تھا کہ آپ اپنے تمن سے باہر کے معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے''۔

دلچسپ تھا ناں کہ آپ کو اقتدار تو ملے مگر اس شرط پر کہ آپ سیاست نہیں کریں گے، سیاسی سرگرمیوں سے واسطہ نہیں رکھیں گے، اور سیاسی دوستوں سے دور رہیں گے۔ یہ بہت کم جگہوں پر ہوا ہوگا، جس میں ایک بلوچستان تھا۔

مگسی قبیلے کے اندر عوام الناس کی طویل اور کٹھن جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز اور گل محمد خان کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ اور بالآخر مگسی قبیلے کی مستقل جدوجہد اور بلوچ عوام کی عمومی حمایت سے 1933 میں گل محمد خان کو سرداری سے علیحدہ کیا گیا۔ اس سارے واقعے کو زیب نے نہایت سادگی سے اس طرح بیان کیا:

مرادِ سلطنت را ترک کردم بہرِ درویشی
چو ابراہیم ادھمؒ ملک و سامان دادم و رفتم

لیکن اس بڑے شاعر کی طرف سے اچھی شاعری کے ذریعے حقائق کو توتو ڑا مروڑا نہیں جا سکتا ناں۔ ''ترک کردم'' اور ''برطرف کردن'' میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

عبدالعزیز کرد نے اسے ''ایک پُرامن اور خاموش انقلاب'' کہا۔

ہم اس انتقالِ اقتدار کو ذرا تفصیل سے دیکھیں گے۔ سردار گل محمد خان اپنے منصبی فرائض کی بذاتِ خود بجا آوری سے ہمیشہ قاصر رہا اور اس کو تمن و جاگیر کا انتظام اپنے عملہ، ماتحت پر چھوڑنا پڑا۔ عملہ نے تمن اور جاگیر کے انتظام میں خرابی پیدا کرنی شروع کر دی۔ اور چند سالوں کے اندر اندر طوائف الملوکی اور بدنظمی کا دور دورہ ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سردار اور اس کے عملہ کے خلاف بے چینی پھیلنے لگی جس کو دُور کرنے اور حالات کو معمولی رفتار پر لانے کے لیے مرکزی حکومت (حکومتِ کلات) کو تھوڑے تھوڑے عرصہ کے واسطے کئی دفعہ مگسی قبیلہ اور جاگیرِ جھل کا انتظام اپنے افسروں کے سپرد کرنا پڑا، لیکن ہر بار اس طریقہ نے قوم کو مطمئن کرنے کی بجائے زیادہ بے چین کر دیا۔ 1930 میں مگسی قبیلہ مایوس ہو گیا اور عملہ انتظامیہ کی بے اعتدالیوں سے سخت تنگ آ گیا، جس سے قوم کے اندر اس حد تک بے چینی پھیل گئی کہ سردار اور ان کے عملہِ منتظمہ کے لیے حالات پر قابو رکھنا سخت مشکل ہو گیا جس پر سردار گل محمد خان نے نواب سر میر شمس شاہ وزیر اعظم ریاست کلات سے درخواست کر دی کہ مگسی قبیلہ اور جاگیر جَھل کے نظم و نسق کو احسن طریق پر چلانے کے لیے اس کو اس کے چھوٹے بھائی نواب زادہ میر یوسف علی خان کی خدمات دی جاویں۔

میر یوسف علی خان اُن دنوں اس جُرم کی پاداش میں کہ اس نے ایک اخباری آرٹیکل کے ذریعہ اہلِ بلوچستان کو بیداری اور اصلاح ملک و ملت کی دعوت دی ہے، بمقام کلات نظر بند تھا۔ سردار گل محمد خان کی یہ درخواست شمس شاہ کی پالیسی کے خلاف تھی، اس لیے اس نے اس کو نامنظور کر کے جاگیر جَھل اور مگسی قبیلہ کا انتظام ریاست کے ایک سپیشل افسر منشی جہان سنگھ نائب کے سپرد کیا اور سردار گل محمد خان کو خاموش رکھنے کے واسطے بمقام مستونگ نظر بند کر دیا۔ اسی جابرانہ پالیسی نے آزادی کے خوگر مگسیوں کو مطمئن کرنے کی بجائے سخت مشتعل کیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ چند ماہ کے بعد مگسیوں نے میر یوسف علی خان کی رہائی پر اس کی قیادت میں بلوچستان کو خیر باد کہہ کر سندھ کی طرف ہجرت کی اور وائسرائے کے پاس وفد بھیج کر اپنی تمنی آزادی کا مطالبہ کیا اور سر شمس شاہ کی پالیسی کے خلاف احتجاجی آواز بلند کی۔

''البلوچ'' کے 17 ستمبر 1932 کے شمارے میں صفحہ 6 پر عبدالعزیز کرد صاحب لکھتے

ہیں: ''اسی اثنا میں محمود خان کی وفات سے ریاست کلات کی حکومت میں اچانک انقلاب رونما ہوا۔ محمد اعظم جان ریاستِ کلات کا جدید فرمانروا بن گیا۔ شمس شاہ نے منصب وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ نئی حکومت نے سردار گل محمد خان کو رہا کر دیا، اور جاگیر جَھل سے اپنا کنٹرول اُٹھا کر مگسیوں کو سندھ سے واپس بلا کر مطمئن کیا اور تمن و جاگیر کے نظم و نسق کو خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے کے لیے نواب زادہ میر یوسف علی خان کی تجویز سے قابل اور فہمیدہ افراد مگسی کی ایک انتظامیہ کونسل کی تشکیل ہوئی۔ لیکن چند ماہ کے بعد اراکین کونسل اور سردار گل محمد خان کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے اور یہاں تک کشیدگی بڑھ گئی کہ کونسل کو احتجاج کے طور پر مستعفی ہو جانا پڑا۔ اس واقعہ سے قبیلہ کے اندر از سرِ نو بے چینی پھیلنے لگی اور سردار گل محمد خان معہ اپنے عملہ انتظامیہ کے حالات پر قابو پانے سے عاجز آ گئے۔ حتیٰ کہ سردار کی درخواست پر قبیلہ مگسی اور جاگیر جھل کا انتظام ایک دفعہ پھر ایک سرکاری افسر خان بہادر نبی بخش خان کے سپرد کیا گیا۔ لیکن مگسیوں نے اس طریقہ کو پسند نہ کیا اور مرکزی حکومت کلات کی خدمت میں پے در پے وفود بھیج کر اصلاحِ احوال کا پرزور مطالبہ کیا۔ اس پر خان نے مگسی قبیلہ کا نمائندہ جرگہ منعقد کرا کر آئندہ نظم و نسق کے متعلق رائے طلب کی۔ مگسی جرگہ نے ماضی کے تجربات کا مفصل حوالہ دے کر مطالبہ پیش کیا کہ سردار گل محمد خان کو انتظامی کمزوریوں کی وجہ سے معزول کر کے ان کی بجائے نواب زادہ میر یوسف علی خان کو مگسی قبیلہ کا مستقل سردار مقرر کیا جاوے۔ دستورِ ریاست کے مطابق مگسی قبیلہ کا یہ جمہوری مطالبہ حصولِ رائے کے واسطے مرکزی سٹیٹ کونسل (ریاستِ کلات کا ادارہ جو سرداروں پر مشتمل تھا) کے سامنے پیش ہوا۔ کونسل نے ایک تمنی سردار کی معزولی کو رواج کے برخلاف قرار دے کر مگسی جرگہ کے مطالبہ کی سختی کے ساتھ مخالفت کی تا کہ آئندہ کے واسطے قوم کے جمہوری مطالبات کا تسلیم کیا جانا نظیر نہ بن سکے۔

لیکن خان نے مگسی قبیلہ کے جمہوری مطالبہ کو سٹیٹ کونسل کے غیر مدلل مخالفت پر ترجیح دے کر سردار گل محمد خان کی معزولی اور سردار یوسف علی خان کی جانشینی کا اعلان کر دیا، اور اس طرح سے بلوچستان کی قومی تحریک کے بانی مبانی نواب زادہ میر یوسف علی خان کی زندگی کے تیسرے باب کا آغاز ہوا۔

یہاں یہ امر واضح کر دینا ضروری ہے کہ جب سے مگسیوں کے اندر سابق سردار گل محمد خان کے خلاف بے چینی پیدا ہونا شروع ہوگئی تھی، اور سردار یوسف علی خان نے یہ سُنا تھا کہ قوم ان کو سردار منتخب کرنا چاہتی ہے تو اس نے عہد کیا تھا کہ وہ ہرگز سرداری کو قبول نہ کرے گا۔ چنانچہ وہ بارہا اپنے اس عقیدے کا اظہار تقریر و تحریر کے وزیعہ پبلک کے سامنے کر چکا۔

میر یوسف علی خان کا یہ فیصلہ اٹل تھا اور وہ اس پر آخیر دم تک قائم تھا۔ لیکن قدرت کا فیصلہ اس کے خلاف اور کچھ تھا۔ مگسی قبیلہ سالہا سال سے خوار و خراب ہو رہا تھا، عدل اور انصاف کا جنازہ نکل چکا تھا، فسق و فجور نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ تعلیم کی روشنی سے ساری قوم محروم تھی اور بڑی تیزی کے ساتھ جہالت کی تاریکی میں تباہی کی طرف گامزن تھی۔ داخلی نظم و نسق درہم برہم ہو کر ہر طرف بدنظمی اور طوائف الملوکی کا زبوں ترین مظاہرہ ہو رہا تھا، قومی افراد کے اندر باہمی اخوت و مساوات مفقود ہوگئی تھی۔ اور فضا روز بروز نفاق انگیز ہوتی جا رہی تھی، اور سب پر طرہ یہ کہ قبیلہ کی داخلی آزادی جو اقوام کا پیدائشی حق ہے، خطرہ میں پڑ گئی تھی۔ یوسف علی خان کو اپنا فیصلہ بدلنا ہی پڑا۔

''فروری 1933 میں مگسی قبیلہ کے تمام سرکردہ نمائندے بمقام سبی میر یوسف علی خان کے پاس آئے۔ اور قوم کا جمہوری فیصلہ اس کے سامنے رکھ کر بڑی شدت کے ساتھ اصرار کیا کہ وہ قوم کو تباہی سے بچانے کی خاطر قومی فیصلہ کو لبیک کہہ کر سرداری قبول کر لے۔ اس کے علاوہ بعض احباب بھی وقتاً فوقتاً میر یوسف علی خان سے تبادلِ خیال کے دوران اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ اور انھوں نے ٹھوس دلائل کے ذریعہ میر یوسف علی خان کو اس امر کا قائل کر کے چھوڑا کہ کسی دنیاوی عز و جاہ اور حبِ منفعت کے واسطے نہیں، بلکہ صرف خدمت و اصلاح قوم کے واسطے اُسے جمہوری فیصلہ کے سامنے جھک جانا چاہیے۔ ان فاتح لوگوں میں مولانا میر لطف علی خان مگسی خاص طور پر قابلِ ذکر اور مستحقِ داد تھا۔

اس لیے اس کو مجبور ہو کر منشائے قدرت کے سامنے سر تسلیم خم کر کے مگسی قبیلہ کا سردار بن جانا پڑا۔''

عبدالعزیز کرد نے اس موقع پر لکھا:

''رواج چلا آتا ہے کہ ایسے مواقع پر جس شخص کو کوئی ایسا اعزاز نصیب ہوتا ہے تو ہدایائے تبریک و تہنیت کی دھوم دھام شروع ہو جاتی ہے، لیکن چونکہ یہ سرداری میر یوسف علی خان کے ساتھ ان کی خواہش کے برخلاف چپک گئی ہے، اس لیے ہم اس نئے اعزاز پر ان کی خدمت میں تو کوئی رسمی ہدیہ تبریک پیش نہیں کر سکتے۔ ہاں البتہ ہم خوش نصیب مگسیوں کو تہہ دل کے ساتھ اس امر پر مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ ظلمت کدہِ بلوچستان کے اندر انھوں نے رواج کے بت کو سب سے پہلے چکنا چُور کر کے اسلام کی جمہوری بنیادوں پر اپنا قومی سردار اپنی منشا کے مطابق منتخب کیا ہے جو امید ہے کہ بلوچستان کے مستقبل کے واسطے ایک فال نیک ثابت ہوگا۔

''جہاں ہم نے سردار یوسف علی خان کی خدمت میں اس نئے اعزاز پر رسمی ہدیہ تبریک و تہنیت پیش کرنے سے اغماض کیا ہے وہاں ہم اُن کی خدمت میں بلوچستان کی نیشنل پارٹی کے نوجوانوں کی طرف سے یہ پیغام عرض کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ اب آپ کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ نہ صرف یہ کہ بلوچستان اور ہندوستان کے اکثر لوگوں کی نظریں آپ پر لگی ہوئی ہیں کہ آپ کی نئی زندگی آپ کو عملاً کس طرف کھینچے گی، بلکہ قدرت نے بھی آپ کو ایک عملی آزمائش کے اندر ڈال دیا ہے۔ خدائے قدوس نے آپ کو ایک ایسی قوم کا چوپان مقرر کیا ہے جو گوناگوں تاریکیوں کی وجہ سے تباہی کے قریب پہنچ گئی ہے۔

ہماری دعا ہے کہ خدائے ذوالجلال آپ کو سلامت روی کے ساتھ اپنے منصبی فرائض کی بجا آوری کی توفیق عطا فرمائے اور گمراہی سے بچائے''۔ (البلوچ۔ جون 1933)

ایک عرصے تک یوسف کی سرداری کی دستار بندی کی تاریخ کے بارے میں کنفیوژن مسلط رہی۔ یہ مسئلہ بھی سارے بلوچوں اور جمہوری انسانوں کے محسن اخبار، ہفت روزہ ''البلوچ'' نے حل کر دیا۔ اس کے شمارہ 4 جون 1933 کے صفحہ 3 پر میر عبدالعزیز کرد، اور شمارہ 11 جون 1933 کے صفحہ 2 پر میر لطف علی خان کے مضمون چھپے۔ میر لطف علی کے آرٹیکل سے یہ ٹکڑا: ''جناب اعلیٰ حضرت بگلر بیگی ہز ہائی نس والی قلات (اعظم جان) و جناب جلالت مآب ایجنٹ ٹو گورنر جنرل

فرماں روائے بلوچستان نے بموقع جلسہ وجرگہ سیبی سالِ رواں (فروری 1933) میر گل محمد خان کو سرداری سے معزول کر کے اُس کی جگہ اس کے بھائی سردار میر محمد یوسف علی خان صاحب کو سرداری دینے کی تجویز عمل میں لائی۔ چنانچہ اب ماہ مئی 1933 کو گورنمنٹ آف انڈیا کی منظوری آنے کے بعد جناب اعلیٰ حضرت والی قلات نے کوئٹہ میں سرداری کا اعلان فرمایا۔ اعلان کے بعد جب سردار میر محمد یوسف علی خان صاحب جھل اپنے وطن میں تشریف لائے تو تمام قوم مگسی نے ان کو باقاعدہ قدیمی دستور کے مطابق قبیلہ وار اُن کی دستار بندی کرادی''۔

یعنی 1933 میں گل محمد زیب مگسی کو نوابی سے معزول کر کے، مگسی قبیلہ کے اٹھارویں سردار کے بطور یوسف کی دستار بندی ہوتی ہے۔

مگسی صاحب کے بارے میں اُس کے قریبی ساتھی مولانا عبدالکریم نے لکھا؛

''ایک شخص اپنے ملک وقوم کی اصلاح کا درد لے کر اُٹھتا ہے، اپنے جذبہِ جدت کو لے کر اپنی قوم کو روحانیت سکھلاتا ہے۔ مواخات ومواسات کے سبق پڑھاتا ہے۔ مساوات، اتفاق اور یک جہتی کی روح پھونکتا ہے۔ اور ان کو اسلام کی سچی اور کفر سوز تعلیم سے آگاہ کرتا ہے۔ پُرانے مذموم اور شرع شریف کے برعکس ومنافی رسومات کو مٹانا چاہتا ہے، اعلائے کلمتہ الحق کو اپنا فرضِ اولین سمجھتا ہے، اور ایک ایسی فضا میں جو اپنے سات وجہات کی طرف سے کفر وشرک کی ریشہ دوانیوں اور اباطیل کی ہنگامہ آرائیوں سے مکدر اور ایک ہولناک منظر بنی ہوئی ہے، حق وصداقت کا بول بالا کرتا ہے، اور وہ اپنے مقاصدِ محمودہ کی کامیابی کے لیے حتیٰ الوسع ہر ممکن قربانی کرتا ہے۔ قوم کو ایک طویل اور اعضا شکن خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے اپنی جان پر طرح طرح کے مصائب اور اپنے نفس پر شدائد وتکالیف برداشت کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ مجاہد، ایک ایک لمحہ اپنے ملک وقوم کے بہبود وفلاح کی محویت میں گزارتا ہے''۔

11۔ کوئٹہ میں رہائش

خطوط اور دیگر ذرائع سے ہمیشہ یہ تاثر ملتا رہتا تھا کہ یوسف عزیز مگسی کی رہائش گاہ ہمیشہ

سرکاری ریسٹ ہاؤس ہوا کرتے تھے۔ میٹنگیں، مہمانداریاں وہیں ہوا کرتی تھیں۔ حتیٰ کہ اُس کی موت بھی سرکاری ریسٹ ہاؤس میں ہوئی تھی۔

مگر فاطمہ جناح روڈ اور پرنس روڈ کے سنگم پہ بائیں جانب ایک بڑے رقبے پہ چار دیواری دیکھ کر ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ اس میں کوئی رہائش گاہ، کاروباری مرکز یا دفتر وغیرہ کیوں نہیں۔ ہم جب بھی کسی سے پوچھتے تو جواب ملتا کہ یہ مگسیوں کی جگہ ہے۔

بالآخر ہمیں روزنامہ زمیندار لاہور کا 5 اگست 1933 کا شمارہ ملا۔ وہ دراصل اختر علی خان کے دورہ کوئٹہ کی رپورتاژ ہے۔ ہمیں اُس میں دیگر باتوں کے علاوہ مگسی صاحب کی رہائش گاہ کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ ذرا سارا مضمون دیکھیے:

''بلوچستان اور کوئٹہ کے احباب ایک مدت سے دعوت دے رہے تھے کہ میں ان کی محبانہ عنایات کے بالمشافہ حصول کا شرف حاصل کروں۔ چنانچہ ہفتہ گذشتہ میں لاہور سے گاڑی پر سوار ہو کر کوئٹہ پہنچا۔ سٹیشن پر نواب یوسف علی خان مگسی بلوچ کے برادر عزیزی مرید حسین خان مگسی کو دیگر احباب کے ساتھ موجود پایا۔ ان کے علاوہ کوئٹہ سی آئی ڈی کے کارندوں کے ایک بہت بڑے لشکر نے بھی پیشوائی کی۔ جونہی میں نے گاڑی سے اتر کر پلیٹ فارم پر قدم رکھا' ان لوگوں نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا اور میرے قیام اور عزمِ سفر کے متعلق استفسارات کی بوچھاڑ کر دی۔ ان کے سوالات کے مناسب جواب دیے گئے۔ اگرچہ اس سرحدی ملک میں کسی نو وارد کی پریشانی کے لیے خفیہ پولیس والوں کا یہ حملہ کافی سے زیادہ ہے تاہم ان حضرات کا اندازِ گفتگو اور طرزِ ملاقات بہت شریفانہ پایا۔ جو کچھ انھوں نے دریافت کیا، نہایت خوش اخلاقی سے پوچھا۔ اور اپنے اچھے برتاؤ کے ثبوت میں سی آئی ڈی کے دو کارندوں نے میرا سامان اٹھا کر سیشن سے باہر موٹر کار تک پہنچایا۔

''سٹیشن سے روانہ ہو کر میں اپنے احباب کی معیت میں جو سٹیشن پر آئے ہوئے تھے، نواب یوسف علی خان مگسی بلوچ کے بنگلہ واقع پرنس روڈ پر پہنچا۔ نواب صاحب کی ذاتِ گرامی قارئینِ ''زمیندار'' کے لیے کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بلوچستان اور اس کے

باشندوں کی خوش قسمتی سے نواب صاحب سا رہنما اس سرزمین میں پیدا ہوگیا ہے جس کا دل اپنی قوم کی فلاح کے لیے مرغِ قبلہ نما کی طرح تڑپتا ہے۔ مگسی صاحب کے بنگلہ پر دردمند اور زخم خوردہ بلوچوں کا ہر وقت تانتا بندھا رہتا ہے۔ جو اپنی مختلف قسم کی شکایات لے کر آتے ہیں۔ اور اپنے دکھوں کا رونا اپنے ایک ایسے ہمدرد کے پاس آ کر روتے ہیں۔ جس نے اپنی زندگی قوم کے لیے وقف کر رکھی ہے۔

''نواب یوسف علی خان کے بنگلہ پر میرے پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد احباب و اکابرِ بلوچستان کی آمد و رفت شروع ہوگئی جن سے ملاقات کر کے اور جن کے خیالات و افکار سے مستفیض ہو کر مجھے بے حد خوشی حاصل ہوئی۔ بیداری اور اپنی حالت آپ درست کرنے کا جو علم، احساس اہلِ بلوچستان میں پیدا ہو چکا ہے، اس کی بین علامات نظر آ رہی تھیں۔ ہر شخص اسی نشہ میں سرشار نظر آتا تھا کہ جلد سے جلد بلوچ قوم کو ہندوستان کی دیگر اقوام کے دوش بدوش لا کر کھڑا کر دیا جائے اور بلوچستان کو ہندوستان کے دیگر صوبجات کی صف میں ممتاز اور مساوی درجہ کا مقام دلایا جائے۔ خان صاحب چودھری فیروز الدین خاں صاحب سے ملاقات کر کے لطف حاصل ہوا۔ آپ میرے پرانے دوست اور شفیق ہیں۔ اور بلوچستان کی معاشرتی بیداری میں خاص شغف سے حصہ لے رہے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے اصحاب سے ملاقات ہوئی جن کی یاد میرے دل میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔۔۔

''دوسرے دن نواب کی کوٹھی پر آل انڈیا بلوچ و بلوچستان کانفرنس کی مجلسِ عاملہ کے ارکان کا اجتماع شروع ہوگیا۔ کیوں کہ انہی تاریخوں میں مجلسِ عاملہ کا اجلاس شاہی سرائے میں ہونے والا تھا۔ جناب غلام قادر بی اے ایل ایل بی وکیل جیکب آباد اور مدیر ''الحنیف'' جیکب آباد اور ڈیرہ غازی خاں سے سردار غلام رسول قرائی بھی پہنچ گئے۔ ان کے علاوہ سندھ اور بلوچستان کے دیگر اقطاع کے نمائندے بھی تشریف لے آئے اور خوب چہل پہل ہوگئی۔ مسائلِ بلوچستان کے متعلق ان حضرات سے تبادلہِ خیالات ہوتا رہا۔ سب میں یہ مشترکہ خواہش پائی گئی کہ بلوچستان کو جہالت اور قدیم رسم و رواج کے بندھنوں سے نکال کر عہدِ حاضر کی روشنی

میں پہنچایا جائے تا کہ اہلِ بلوچستان زمانہِ جاہلیت کے رواجات کو چھوڑ کر اسلام کی سیزدہ صد سالہ روایات کو تازہ کر دیں اور اسلام کے صوبوں پر گامزن ہو کر بڑی سے بڑی ترقی کی راہ میں گامزن ہوں''۔(11)

12۔انقلابی اصلاحات

سرداری ملنے کے بعد اب ایک اچھا خاصا وسیع علاقہ اور اچھی خاصی افرادی قوت یوسف عزیز مگسی جیسے انقلابی کے ہاتھ آ گئی تھی۔ یہ چھوٹی بات نہ تھی۔ بے پناہ وسائل بھی موجود تھے اور وافر افرادی قوت بھی!!۔

یہ سرداری بہت بڑی تھی۔ بقول مولانا عبدالکریم یہ 80 میل طویل اور 60 میل وسیع علاقہ ہے۔ یہ آباد، سرسبز، اور زرخیز خطہ ہے۔ وہ اُس زمانے میں وہاں قبیلے کی آبادی ستر اسی ہزار بتاتا ہے۔ آبادی زیادہ تر زراعت پیشہ تھی۔

خان عبدالصمد اچکزئی کے بقول، ''مگسی سردار کی ساری جائیداد اور چالیس پچاس ہزار تپہ اُن کے حوالے ہوا جو کہ وسیع زمین اور اچھی خاصی ریاست تھی۔ زمینوں سے سالانہ لاکھوں روپوں کی پیداوار ہوتی تھی اور قبیلہ بھی سردار کے کہنے پر جو کچھ وہ مانگتا، دے دیتا۔ اس جاگیر کا نام ''جھل مگسی'' ہے جس کی اپنی عدالت اور جیل ہے۔ یہ علاقہ دیگر منافع بخش اشیا کے ساتھ کلات کے کچھ دیگر سرداروں کی طرح شراب کی اپنی بھٹی رکھتا تھا۔ جہاں ہندو ٹھیکیدار کے ہاتھوں شراب بنتی تھی اور چوری چھپے سندھ بھیجی جاتی تھی، منافع سردار کا۔ ایک ایسا سرداری مضبوط علاقہ، جہاں عام شخص دوسرے سے حال احوال کرتے وقت بھی ''سردار کے سر کی سلامتی'' کہہ کر شروع کرتا ہے۔..... مگسی سردار بھی دوسرے بڑے بلوچ سرداروں کی طرح شاہی جرگے کے علاوہ کلات سٹیٹ کونسل کا ممبر بھی تھا۔ خان قلات بھی کچھ تنخواہ دیتا تھا''۔

مرید حسین ہماری معلومات میں یہ اضافہ کرتا ہے: ''برساتی ندیوں میں مولا، ڈھوری، ڈھورہ، سائی اور بادرہ سے سیلاب ہوتا ہے۔ پہاڑ کے دامن سے کاریزیں (واہیاں) بھی

زرِکثیر خرچ کر کے نکالی گئی ہیں۔ 1932 سے سکھر کے مقام سے دریائے سندھ سے نکالی گئی نہر کیرتھر شاخ ڈھوری سے بھی اراضیات سیراب ہوتی ہیں''۔(12)

اس پس منظر کے بارے میں میر عبدالعزیز کرد نے یہ لکھا:''بلوچستان میں مگسی قبیلہ ایک مشہور قبیلہ ہے، جو ریاست قلات کے بلوچ نیشنل کانفیڈریشن کے ساتھ وابستہ ہوتے ہوئے اپنے تمن اور جاگیر کے داخلی نظام میں دوسرے قبائل کی طرح خودمختار ہے''۔(13)

اب اس خودمختار علاقے اور آمدن کا نظم ونسق آل انڈیا بلوچ کانفرنس کے سب سے فعال ممبر اور لیڈر نے سنبھالنا تھا۔ایک ایسے شخص نے ،جس کے پاس تبدیلی کا ایجنڈہ تھا۔اور ایجنڈے کی حمایت اُس چار روزہ آل انڈیا بلوچستان سطح کی جیکب آباد کانفرنس نے کردی جو ابھی ابھی ختم ہوئی تھی۔

''مادرِ وطن کے اس جلیل القدر فرزند نے جو پیغام اپنی قوم کو دیا، اُس سے اُنھوں نے شاندار''حیاتِ قومی'' کا سبق سیکھا۔'' قائداعظم کے لقب یافتہ (ہم 1930 کی دہائی کے اولین سالوں کی بات کررہے ہیں۔مصنف) اِس انقلابی کی دلی آرزو تھی کہ اقوامِ بلوچستان اپنے ماحول کو تہذیب وتمدن اور اصلاح وارتفاع سے بلند ولطیف بنانے میں کامیاب ہوں۔اس لیے اس نے اپنی قوم کو انسانیت وتمدن کی طرف رجوع کرنے کی خاطر توعیظ واصلاح کی روح اُن میں پھونک کر شاہراہِ ترقی پر گامزن کرنے میں اپنی زندگی کے بہترین لمحے صرف کیے!''(14)

یہ ایک ایسا موقع تھا جہاں نواب یوسف عزیز کے گفتار اور عمل کے مابین موجود کوئی معمولی تضاد بھی ابھر کر سامنے آسکتا تھا۔مگر،مگسی صاحب نے اصلاحات کے بارے میں اپنے نظریات کو عملاً نافذ کرنے کا فیصلہ کیا۔

ایک مشکل مجھے بطور مصنف درپیش ہے۔وہ یہ کہ اِن زبردست اصلاحات کو کس کے حصے میں ڈال دوں: یوسف مگسی کے، یا اس کی سیاسی پارٹی''آل انڈیا بلوچ کانفرنس'' کے؟۔یوسف کا نام اس لیے حذف نہیں ہوسکتا کہ اس نے ہی بہ حیثیت سردار یہ سارے کام کیے تھے۔اور اس میں تنظیمی طور پر پارٹی کا کوئی رول نہ تھا۔مگر، تعلیمات تو بہر حال پارٹی کی تھیں۔ پارٹی نے اپنی

قراردادوں، تحریروں ،تقریروں اور مباحثوں میں ایسا روڈ میپ تیار کیا تھا۔لہٰذا یہ دونوں کی خوش بختیاں ہیں۔ دونوں توصیف کے حق دار ہیں۔

آیئے اِن اصلاحات کا تذکرہ کرتے ہیں:

واٹر سپلائی، سرائے، ڈسپنسری، نیا شہر

یوسف نے مسافروں کی رہائش اور خوراک کے لیے سرائے تعمیر کرنے شروع کردیے۔

غریب عوام کے علاج معالجے کے لیے ڈسپنسری قائم کی جس میں مفت دوائی ملتی تھی۔معالجوں کی تنخواہ اور ادویات کی مد میں اخراجات یوسف عزیز کے ذمے ہوا کرتے تھے۔

اس نے ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی جس کا نام ،اُس نے کوٹ یوسف علی خان رکھا۔ایسا شہر جس میں شہریوں کے لیے بنیادی ضروریات میسر ہوں۔

ایک مہذب وذمہ دار حکومت اپنے شہریوں کو صاف اور میٹھا پانی مہیا کرنے کا پابند ہوتی ہے۔مگسی صاحب نے اس زمانے میں موجود سائنسی اور مالی وسائل کی مطابقت میں اِس عوامی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی۔اس نے اِس دوزخ نما گرم علاقے میں سردار بنتے ہی ایک کام یہ کیا کہ علاقے میں جگہ جگہ پانی سے بھرے بڑے مٹکے رکھوا دیے۔اس نے عوام الناس کے لیے ٹھنڈے پانی کی سبیلیں یوں لگائیں کہ جگہ جگہ پینے کا ٹھنڈا پانی میسر ہوا۔ اِن یوسفی مٹکوں کا نام پڑا:''یوسفی دِلّو''۔

ترغیبات وممنوعات

یوسف مگسی نے بلوچوں کے بہت ہی کھلے ڈلے لباس کی زبردست حوصلہ شکنی کی۔اُس نے اُسے دولت کا ضیاع قرار دیا۔اِس کے لیے اُس نے خود اپنا لباس محض ستر پوشی اور موسمی اثرات کی مطابقت میں کم سے کم رکھا۔اس نے دوسروں کو بھی یہی ترغیب دی۔سب سے نمایاں بات یہ ہوئی کہ اُس نے بیس گز کی پگڑی کو غیر ضروری قرار دے کر اسے چوتھائی حد تک کم کردیا۔اس نے پگڑی

کے بجائے ٹوپی بھی متعارف کرنے کی کوشش کی۔(15)

اس زمانے کے اخبارات شاہد ہیں کہ وہاں سردار کی مرضی سے شراب کے بھٹے قائم تھے۔ سستی اور گھٹیا شراب۔ آمدنی سردار کی ہوتی تھی۔ نیز پندرھویں سولہویں صدی کی بلوچی شاعری کے زمانے سے لے کر آج تک اِس گرم خطے میں بھنگ کا استعمال عام چلا آیا ہے۔ یوسف نے یہ سارا کچھ الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا۔

''سب مگسی مقدموں نے یکجا بیٹھ کر اُن کو منسوخ کر دیا ہے، شراب پینے والا علاقہ جَھل میں فیصدی ایک بھی مسلمان نہیں ملے گا۔ اور بھنگ البتہ چار فیصدی اس وقت پی جارہی ہے، یہ حالات ہیں، دعا کرو!۔''(16)

مساوات کی طرف

دنیا بھر میں فیوڈل اور ماقبل فیوڈل سماجوں میں بہت حقیر اور غلامی کی حد تک گرے ہوئے انداز میں سردار پرستی ہوتی ہے۔ چین سے لے کر جھل تک سردار برگزیدہ اور کرامتوں بھرا مافوق الفطرت آدمی تصور ہوتا تھا۔ اُس کے پاس غیبی قوتیں ہوتی تھیں۔ وہ آسمانوں کا مقرر کردہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے اس کا احترام مذہبی طور پر بھی کیا جاتا تھا۔

چنانچہ پورے بلوچستان میں عوام سردار کے آنے پر تعظیماً اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اُس کے ساتھ چارپائی پر نہیں بیٹھتے تھے۔ بلند آواز اور بے تکلفی سے بات نہیں کرتے تھے۔ اُس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ اُس کی طرف پیٹھ نہیں کرتے تھے۔ اس کے سامنے دروغ گوئی نہیں کرتے تھے۔ جب کوئی قسم یا حلف والی گواہی ہوتی تو سردار کی قسم گویا سچائی کا آخری معیار ٹھہرتی۔ لوگ خدا سے دعا بھی سردار کے طفیل سے کرتے تھے۔

یوسف نے اس مِتھ کو توڑنا چاہا۔ چنانچہ اس نے قبیلے کا ایک جرگہ بلایا اور چاہا کہ سارے امتیازی قوانین ختم کر کے ایک ہی فقرہ رہنے دیا جائے: '' قانون کی نظر میں سب شہری برابر ہوں گے ''۔

خود نواب یوسف علی خان راوی ہے کہ اس انوکھے قانون کے پاس ہونے کی افواہیں جب چہار سمت جَھل میں پھیلیں تو ایک عجیب اضطراب کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ لوگ بے تحاشا دوڑے دوڑے اس انقلابی سردار کے پاس آئے کہ صاحب یہ کیا قیامت کی نشانی نظر آنے لگی کہ سردار کی برابری کرنے لگا، ایک معمولی آدمی؟۔

یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ ہم اپنے آقاؤں کی جگہوں میں پاؤں ڈالیں۔ ہم غلام نمک خوار، ہم خاک پر بیٹھنے والے آج اٹھ کر سردار کے ساتھ بیٹھ جائیں گے؟۔(واقعی قیامت کی نشانی تھی یہ تو، اُس زمانے میں)۔

امین کھوسو نے اِس قانون کے بارے میں لکھا:

''میرے خیال میں بہت سے بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں اس داڑھی صاف، کھدر پوش سردار کی اس تحریک کا سن کر متحیر ہوگئی ہوں گی۔ اور ان کی آنکھوں سے آب جاری ہوگیا ہوگا۔ کہ خدا معلوم آئندہ چل کر کون سی نئی بدعتیں جاری ہوں گی''۔(17)

ہمارے پاس ایک اور معتبر گواہی محترم عبدالصمد خان اچکزئی کی ہے۔ وہ باکمال آدمی 1933 کے اواخر میں یوسف عزیز کو بتائے بغیر اُس کے علاقے چلا گیا اور یوسف کی جاری کردہ معاشی سیاسی اور معاشرتی اصلاحات کا تنقیدی جائزہ لیا۔ اُس نے قبیلے کے بیچ مساوات جاری کرنے کے یوسفی اقدامات کا یوں تذکرہ کیا:

''تمام بلوچ قبائل میں سردار کی اس قدر تعظیم کی جاتی ہے کہ ملاقات کے وقت وہ اُن کے قدموں پر گرتے ہیں، اُن کے برابر کبھی نہیں بیٹھتے اور نہ ہی سردار ایسا پسند کرتے ہیں۔ مگر میرے رفیق نے یہ بھی اُڑا دیا تھا۔ وہ کسی شخص کو اپنے پاؤں پڑنے نہ دیتے تھے بلکہ مخلصی کے ساتھ منع کر کے بہت سمجھاتے تھے کہ میں بھی انسان ہوں تمھارے جیسا ہی۔ اور مجبور کر کے ہر ملاقاتی کو اپنے برابر کرسی پر بٹھاتے تھے۔ نیز یہ کہ جس طرح تمام اقوامِ بلوچ میں رسم ہے کہ قتل ہونے یا دیگر کوئی جرم واقع ہونے پر سردار اور اس کے قبیلے کا معاوضہ دیگر اقوام سے کئی گنا زیادہ ہوا کرتا تھا مگر اس مردِ مجاہد نے اس تفریق کو بھی رواج میں سے اڑا دیا بلکہ جو معاوضہ خود سردار کے لیے ہوگا وہی ہر فردِ قوم

کے لیے بھی ہوگا‘‘۔(18)

جہاں تک فیوڈلزم توڑنے کی بات تھی تو اس نے اِس طرف بھی توجہ دی۔اس نے ایک تو اپنے قبیلے کی زمین کارآمد بنانے کے لیے دریائے سندھ سے کیرتھر نہر نکلوائی۔لوگوں نے اپنی مدد آپ کے تحت یہ سارا کام کر کے دکھایا۔خرچہ البتہ سارا یوسف عزیز کا تھا۔

ساتھ میں اس بلوچستانی ٹالسٹائی نے اپنی بڑی جاگیر سے اُن لوگوں کو زمین دینے کا اعلان کیا جن کے پاس قابلِ کاشت اراضی نہ تھی۔اپنے خلاف زرعی اصلاحات !!۔اور وہ بھی سو برس قبل !!۔

یوسف علی خان ریاستی بلوچستان میں سرداروں کے اختیارات کم کرنے اور جمہوری قدروں کے فروغ کے لیے کوشاں رہتا تھا۔

اس نے تو بہت عرصہ قبل ’’شمس گردی‘‘ نامی پمفلٹ میں لکھا تھا؛’’ہم قلات میں ایسا حکمران چاہتے ہیں جو تختِ نشینی کے فوراً بعد آئینی اور ذمہ دار حکومت کا اعلان کرے اور جہاں ایک اسمبلی قائم ہو۔جس میں لوگوں کے منتخب کردہ نمائندے ہوں۔

چناں چہ یوسف کا ایک اور بڑا کام جھل مگسی کے علاقہ سے باہر کے بلوچوں (یعنی ریاست کلات) کی عمومی سیاسی معاشی حالات میں انقلابی تبدیلیوں کے لیے محنت تھی۔

ہفت روزہ البلوچ، کراچی کے 30 جولائی 1933 کے شمارے میں یوسف مگسی کا ایک مضمون بہ نام ’’پیغام‘‘ چھپا۔یہ دلچسپ تحریر ہے:

’’عشق والوں کو سروکار نہیں باتوں سے
وہ تو دن رات فقط کام کیا کرتے ہیں

’’آج کل جب کہ ہماری حالت پستی کے اس درجہ تک پہنچ چکی ہے، جسے جماعتی اصطلاح میں موت کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔اور جب کہ باہمی نفرت وعداوت کا وہ مرگ آور تخم جسے اگر ناخدایانِ قوم نے سپردِ زمین کیا تھا تو موجودہ آئین نے اس کی آبیاری میں اپنی تمام

قوتیں صرف کر دی ہیں۔ہلاکت وادبار کے انبار اپنی ہر کونپل میں منہ چھپائے منزلِ شباب پر پہنچ چکا ہے۔تو یاد رکھنا چاہیے کہ صرف اخباروں میں مضامین لکھنے یا پلیٹ فارموں پر ولولہ انگیز تقاریر سے سامعین کو مسحور کرنے سے کچھ نہیں بنتا۔یہ اگر قانونِ قدرت ہے کہ ہر ایسے مرحلہ پر اس قسم کے زوال پذیر اقوام میں چند ایک امروز کی شورش میں اندیشہ فردا رکھنے والے اور طوفان آنے سے پہلے آثارِ طوفان کو جانچ لینے والے دردمند پیدا ہوتے ہیں۔اور جو اگر رات تاریک ہے تو ان کی بلا سے، اسبابِ سفر مفقود ہیں تو غم نہیں۔وہ؛

میں ظلمتِ شب لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شررفشاں ہو گی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہو گا

کی ظلمت شگاف صدائیں لگاتے ہوئے گامزنِ منزل ہوتے ہیں۔تو یہ بھی نہ صرف صحیح ہے بلکہ ضروری ہے کہ وہ صرف صدائیں نہیں لگاتے، صرف مضامین نہیں لکھتے۔بلکہ ایمان اور ارادہ کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر ان اسباب کو مہیا کرنے میں عملاً مصروف ہو جاتے ہیں جن سے قوموں کی بگڑی بنائی جاسکتی ہے، جن سے روٹھی ہوئی قدرت کو پھر منایا جاسکتا ہے۔میں یہاں بالا جمال صرف یہ عرض کر کے معذرت کا خواستگار ہوں گا اور میرے مخاطب فطرت کے وہ حسین اور صورت عمل نقوش ہیں جسے نسلِ جدید کہا جاتا ہے۔

نوجوانانِ قوم بلوچ وبلوچستان کا فرض ہے کہ اپنے دائرۂ عمل کے اندر یا کم از کم اپنے گھروں کے اندر اپنے لیے ایک لائحہ عمل مقرر کر لیں گے۔

1۔ کم از کم وہ اپنے گھروں سے فرقہ بندی اور پارٹی بازی کو ختم کر کے ہی چھوڑ دیں گے۔

2۔ اور حصولِ تعلیم اور تبلیغِ حصولِ تعلیم دیگر روزمرہ ضروریات زندگی کے مانند اُن کا فرض ہوگا۔

3۔ ہر بری اور مسرفانہ اور ہمت شکن رسم (جس میں پیر پرستی، قحبہ پرستی اور سرمایہ پرستی بھی شامل ہیں) کی مذمت اور بیخ کنی نوجوانوں کا فرض ہوگا۔

4۔ ہر وہ اعتقاد یا ہر وہ نیاز وسرافگندگی جو اللہ کے لیے ہونی چاہیے، اس میں کسی گوشت

و پوست کے بت کو شریک نہیں بنانا چاہیے۔ چاہے اس نے اپنے بت کے اوپر کس قدر ہی سونا اور چاندی لیپ لیا ہو۔ یا اپنی قدرت میں لوہے کے ایک دھار دار ہتھیار یا سوراخ دار نالی جس میں سیسہ اور باروت بھر کر آواز نکالا جاتا ہو، رکھتا ہو۔

ہمارے بد بخت ملک کے نوجوان اگر دو سال ایک منتظم پروگرام کے ساتھ اس لائحہ عمل پر کام کرنا شروع کر دیں تو انشااللہ ہم اپنی کھوئی ہوئی معصومیت اور زائل شدہ اقتدار کو جلد حاصل کر لیں گے۔ مجھے اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ ہماری ذلت میں اس آئین کو جسے آپ مختلف نام مثلاً فرنٹیر ریگولیشن جرگہ سسٹم دے سکتے ہیں، بہت حد تک دخل ہے۔ اور بدقسمتی سے حکومت اب تک اس رسوائے زمانہ سسٹم کے قیام میں اپنے شاہی مفاد کو ستور سمجھتی ہے۔ مگر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اپنی خود فراموشیاں اور سیہ کاریاں بالکل نظر انداز کی جائیں۔

ہمیں اصولاً حکومت سے شاکی بھی ہونا نہیں چاہیے۔ ہر فرد یا ہر جماعت اور حکومت کا فرض ہے کہ اپنے مفاد کو محفوظ رکھنے کے لیے ہر ممکن سعی کرے۔ کاش کہ روحانیت یا عام محبتِ انسانی کے نظریہ کی حکومتیں بھی قائل ہوں۔ اس لیے کسی دوسرے کا شاکی ہونے کی بہ نسبت یہی احسن ہے کہ ہم اپنی فطرت صحیحہ کی تشخیص کریں اور خود اپنے آپ کو قابلِ عزت بنا کر، اپنی عزت کرنا سیکھیں۔

محبت سے ہی پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

اور

یقینِ محکم، عملِ پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

آپ کا غمخوار بھائی
محمد یوسف علی خان عزیز (بلوچ)''

***

ستمبر 1933 کو ایک سال دس ماہ کی مختصر مدت کلات تخت پر بیٹھنے کے بعد محمد اعظم کا انتقال ہو گیا تو 20 نومبر 1933 میں مگسی صاحب نے بحیثیت مگسی سردار کے، احمد یار خان کی دستار بندی میں حصہ لیا۔ یوں (بظاہر!) انجن اتحادِ بلوچستان کے فکر سے متاثر ایک اور آدمی اقتدار پر فائز ہوا۔ واضح رہے کہ اس شہزادے کے بلوچ کانفرنس یا انجمن اتحادِ بلوچستان کے قائدین سے اچھے تعلقات تھے۔

یوسف عزیز انجمن کی طرف سے ''سٹیٹ کونسل'' کا ممبر بھی تھا۔ اس نے اپنے نظریے کے مطابق ایک بار پھر مطالبہ کیا کہ قلات میں عوام کے سامنے جواب دِہ حکومت قائم کی جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ سٹیٹ کونسل کے اختیارات میں توسیع ہو، جس میں بجٹ پر بحث و مباحثہ کرنے اور اسے منظور کرنے کے اختیارات شامل ہوں۔ اسے وزرا کے کام پر تبصرہ اور رائے دہی کی اجازت ہو۔ وہ وزیروں کی تعداد میں بھی اضافہ چاہتا تھا۔

بھئی اس کی روداد تو ہمیں خود مگسی صاحب کی زبانی سننی چاہیے؛ اُس کا وہ خط ملاحظہ کریں جو اس نے اس بارے میں امین کھوسہ کو 14 اگست 1933 کو کلات سے لکھا تھا۔

''بھائی صاحب! السلام علیکم! کل شام کو یہاں پہنچا، رسمی امور کے اختتام کے بعد رات کو سردار شاہوانی کے سامنے میں نے اپنے خیالات کو بیان کیا۔ سردار موصوف میرے ساتھ بالکل متفق ہو گئے، اور میرے خیالات کی تعریف کی۔ خیالات تو آپ کو معلوم ہیں، یعنی سٹیٹ کونسل کے اختیارات میں توسیع، جس میں بجٹ پر بحث و مباحثہ مع منظوری اختیارات کے، اور وزرا کے کام پر تبصرہ اور رائے دہی اور ریاست کے مفادِ اجتماعی کے لیے دیگر مفید سکیموں کو دربار میں پیش کرنا اور دیگر وزیروں کی تعداد میں اضافہ (شامل ہیں)۔

''۔۔۔صبح کو نواب رئیسانی کے ساتھ یہ گفتگو بندہ نے کی۔ چنانچہ سید اورنگ شاہ اور نواب رئیسانی بھی متفق ہو گئے اور بندہ نے اس سکیم کو برائے مشورہ مزید احمد یار خاں کے پیش کیا تو انھوں نے بھی یہی کہا کہ آپ اسے سرداروں کے سامنے پیش کریں، میں بصد خوشی تیار ہوں۔۔۔ چنانچہ آدھ گھنٹے کے اندر اگرچہ دیگر رفقا بالکل سرد پڑ گئے تھے، مگر وزیر اعظم کی کوشش سے سٹیٹ

کونسل کے ارکان اور ایک دو اور سرداروں کو یک جا کیا گیا، جس میں احمد یار خاں، وزیراعظم، یہ سب موجود تھے۔ مجھے کہا گیا کہ آپ اپنی تحریک کو پیش کریں۔ چنانچہ بندہ نے دس پندرہ منٹ کی تقریر کے اندر اپنی تحریک کو پیش کیا۔ ختم کرتے ہی زرکزئی سردار اور وڈیرہ بنگلزئی نے بغیر کسی دلیل وحجت کے جاہلانہ طریق پر مخالفت کی۔ پھر لہڑی سردار نے تو سرے سے سٹیٹ کونسل کی ہی مخالفت کی۔ مگر بنگلزئی کی مخالفت بالکل جاہلانہ اور زوردار طریق پر تھی۔ میں نے پھر ایک مختصر سی تقریر کی جس میں وزیراعظم نے میری تائید کی مگر افسوس ہے کہ طنز آمیز جملوں سے وہ بھی بچ نہ سکے۔ میں محسوس کرتا تھا کہ احمد یار خان شاید دل سے خوش ہو رہا ہے۔ مجلس کا رنگ دیکھ کر نواب رئیسانی اور شاہ وانی نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا مگر ان الفاظ کے ساتھ کہ آپ کی تحریک اچھی ہے مگر افسوس کہ حالات ویسے نہیں۔ آخر میں میں نے کہا کہ مجھے آپ کی حالت دیکھ کر احساس تھا کہ میری تحریک کا کیا حشر ہوگا اور میرے متعلق آپ سب حضرات کے دل میں مع شہزادہ صاحب کس قسم کے جذبات پیدا ہوں گے، مگر تاہم شکر ہے کہ میں اپنے ضمیر، اپنی قوم اور غربا کی ترجمانی کے سپردہ فرض کے آگے بخل نہیں ہوا، اور وقت آئے گا کہ آپ یا آپ کی نسلیں پشیمان ہوں گی، وغیرہ وغیرہ۔

''یہ ہے حال بھائی ہمارا! عجیب قسم کے جانور ہیں۔ اب میرے لیے دو راہیں ہیں: ایک تو یہ کہ جرگہ کے آخری دنوں میں شہزادہ صاحب کے حق میں رائے دینے کے ساتھ اپنی مندرجہ بالا سکیم کو پیش کروں، اور دوسری یہ کہ ان نااہل سرداروں کے اختیارات اور حقوق کے خلاف اُس کی ہر تحریک کی تائید کروں گا۔ اور اب سرداروں کو کچلنا چاہیے، ان سے سدھرنے کی امید فضول ہے''۔ (19)۔

یوسف مگسی نے کلات کی حکومت میں بڑے پیمانے پر اصلاحات نافذ کرانے کی جدوجہد کبھی ترک نہ کی۔ گو کہ یہ کوئی نیا اقدام نہ تھا۔ اس عمل کا ارادہ تو وہ اور اُس کی پارٹی بہت پہلے ہی کر چکے تھے۔ چنانچہ سال 1931 میں مشہورِ زمانہ پمفلٹ ''شمس گردی'' ہی میں انجمن اتحادِ بلوچاں نے نواب زادہ کی رہنمائی میں حکومت کے آئندہ نظام کو ان الفاظ میں پیش کیا تھا:

''ہم کلات میں ایسا حکمران چاہتے ہیں جو تخت نشینی کے فوراً بعد آئینی اور ذمہ دار

حکومت کا اعلان کرے اور جہاں ایک اسمبلی قائم ہو۔ جس میں لوگوں کے منتخب کردہ نمائندے ہوں۔ چار مقامی اور لائق آدمیوں پر مشتمل مستقل کابینہ بنے۔ جس کا سربراہ ذہین اور مصلح ہو۔ محکموں کی تقسیم اس نہج پر کی جائے:

وزیراعظم: محکمہ داخلہ اور انڈیا گورنمنٹ کے ساتھ تعلقات،

وزیر مال، محکمہ مالیات،

وزیر اطلاعات، محکمہ انصاف، وزیر رفاہِ عامہ، تعلیم صحت اور زراعت،

چوتھا وزیر ریاستی افواج، پولیس، قانون اور نظم ونسق کا انچارج ہو.....

یہ کابینہ اسمبلی کے سامنے جواب دِہ ہو تا کہ سرشمس شاہ کے عہد کی بدعنوانیاں دہرائی نہ جاسکیں''۔

میر یوسف عزیز اور اُس کے تحریکی رفقا ریاست میں ایک منتخب حکومت کا قیام چاہتے تھے۔ اس کے نتیجے میں ایک کابینہ بنتی جو عوام کے سامنے جواب دہ ہوتی۔ اس کے مطلب بہ یک وقت دو تھے: سرداری جرگہ نظام کا خاتمہ، اور برطانوی حکمرانی کا خاتمہ۔

ہم جانتے ہیں کہ اِن ساری اصلاحات کے لیے ایک ''اچھا'' اور ''مضبوط'' خانِ کلات چاہیے تھا۔ یوسف اور اس کے کامریڈوں نے اس بارے میں اعظم جان کی تقرری کے لیے زبردست مہم چلائی تھی۔ انھیں بالآخر زبردست کامیابی ہوئی اور اعظم جان خانِ کلات مقرر ہوا تھا۔ گو کہ میر اعظم جان کی تخت نشینی میر یوسف علی خان اور اس کے رفقا کی بڑی کامیابی تھی، مگر ہم نے دیکھا کہ یہ خوشی اور کامیابی مختصر نکلی۔ ہماری پوری تاریخ کی دوہرائی والا قصہ ہوا یہاں بھی۔ بلوچ کے تاریخی قانون اور اٹل حقیقت کی پیروی میں، اعظم جان نے خان بن جانے کے بعد انجمن کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ اس نے ایک ذمہ دار اور نمائندہ حکومت قائم کرنے کا اپنا وعدہ بھلا دیا۔ چنانچہ انجمن اپنی ساری خوش فہمی کو جھٹک کر پھر سے سیاسی کام میں جت گئی۔

چنانچہ، ہم ذکر کر چکے ہیں کہ نئے خانِ کلات میر اعظم جان سے انجمن کو جو توقعات

تھیں، وہ پوری نہ ہوئیں ۔اُس کے اور انجمن کے بیچ فاصلے بڑھتے گئے ۔ خان نے اپنے سابقہ مددگار (اور اصل میں اُس کے ہاتھوں استعمال ہونے والے) انجمنی دوستوں کی آدرشوں کو صرف ترک ہی نہ کیا بلکہ وہ اُن کو سزا کی دھمکیاں بھی دینے لگا۔

یوں انجمن کو اپنے رومانٹک نقطۂ نظر کا قبلہ درست کرنا پڑا تھا۔ ویسے تو یہ قبلہ حتمی طور پر آج تک درست نہ ہوا۔ اور ہم زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر انفرادی یا اجتماعی طور پر بہر حال ایک ہیرو، ایک مشکل کشا، ایک سائیں، ایک بھوتار کی آرزو کر کے اُسے الفاظ اور دلائل کا جامہ پہنا کر ایستادہ کرتے ہیں، پھر اس کی پرستش ہوتی ہے اور بہت دیر بعد ہماری نیک خواہشات کو کمر توڑ ٹھوکر لگتی ہے اور ہم پھر سنبھلتے ہیں ۔لیکن اِس دوران بہت سے سادہ لوح لوگوں کو ہم گمراہ کر چکے ہوتے ہیں۔ اور روایات و رواجوں کی پڑھائی ہوئی ہماری اپنی پٹّی اُن کے دل سے اترتے نہیں اترتی۔ حالاں کہ ہمارے آبا تک یہ جان گئے تھے کہ سیاست میں ہیرو اگر ہمارے رومانٹک خیالات کے لیے ہی باعثِ تقویت ہیں تو وہ سامراجی عزائم کی تکمیل کی ضرورت بھی ہیں۔

یہ تذکرہ بھی ضروری ہے کہ جب اپریل 1932 کو میر اعظم جان کی تاج پوشی ہو رہی تھی تو ایک جانب انجمن کے ہمارے اکابرین خوشیاں منا رہے تھے اور دوسری جانب تاجِ برطانیہ کا نمائندہ اور وائسرائے ہند لارڈ ولنگٹن اُسے بتا رہا تھا کہ ''تم صرف ریاستِ کلات کے حکمران نہیں ہو بلکہ ایک قدیم اور مضبوط کنفیڈریسی کے سربراہ بھی ہو۔ اس لیے یہ مناسب ہے کہ تم اپنے سرداروں کے صلاح و مشورے سے اور انھیں ساتھ ملا کر کام کرو، ان کے حقوق کی عزت کرو اور اپنے وقار کو برقرار رکھو۔''

ان نیک مشوروں کے علاوہ اب ملاحظہ کریں کہ ایک عالمی سردار (لارڈ ولنگٹن) ایک علاقے کے سردار (اعظم خان) کی پیٹھ کس طرح تھپکاتا ہے؛ ''ہر حکمران کو مشکل اور پریشانی کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر خدانخواستہ ایسا وقت پہنچے، تو تم کو یقین کرنا چاہیے کہ ہمارے افسر تمھیں ہر قسم کی امداد اور مشورے دیں گے۔ مطمئن رہو کہ میں بذاتِ خود ہمیشہ تمھاری ریاست کے معاملات میں مستقل اور گہری دلچسپی لیتا رہوں گا''۔

اعظم جان، 1931 میں، خان بن گیا تھا اور انجمن واپس اپنی سیاسی اوقات میں لوٹ آئی تھی۔ بالکل اسی طرح احمد یار، خان بن گیا تھا۔ اور انجمن (اب آل انڈیا بلوچ کانفرنس) پھر اپنی سیاسی اوقات میں لوٹ آئی۔ کوئی سیاسی اصلاحات نہ ہوئیں۔

تعلیم

ہم پچھلے صفحات میں ذکر کر چکے ہیں کہ ایک بے علم علاقے سے وابستہ اِس بڑے انقلابی نے اپنی سیاسی پارٹی (آل انڈیا بلوچ کانفرنس) کے جہاندیدہ اور علم و مطالعہ سے منور سینئر لوگوں کے ساتھ مل کر تعلیم عامہ پہ زبردست قراردادیں اور منصوبے تیار کر رکھے تھے۔

آج اُسے اپنے محدود علاقے تک ہی سہی، یہ موقع تو ملا تھا کہ وہ اپنے نظریے کے مطابق پبلک ایجوکیشن کو منظّم کر سکے۔

گو کہ سماجی تبدیلی ایک باشعور سماجی تنظیم کی منظّم تحریک سے ہی آتی ہے۔ اور اس سلسلے میں تعلیم کا الگ سے اثر محدود ہوتا ہے۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ تعلیم انسان کو بدل کر رکھ دیتی ہے ۔لہٰذا اِس کے بغیر نہ سماجی شعور جامع انداز میں ملتا ہے، نہ سماجی تحریک بنتی ہے اور نہ انقلابی تنظیم وجود میں آسکتی ہے۔

بالخصوص جب سماج پری فیوڈل مضبوط ستونوں پر استوار ہو تو اس میں معمولی سی دراڑ بھی غنیمت ہوتی ہے۔ اور تعلیم زبردست دراڑیں ڈالنے والی طاقت ہوتی ہے۔

چنانچہ یوسف نے (پہلے قدم کے بطور) 15 اکتوبر 1933 کو جھل مگسی کے ایک وسیع قطعے پر ''جامعہ یوسفیہ'' کے نام سے ایک ہائی سکول کی بنیاد ڈالی۔ (اور، جامعہ کا مطلب تو یونیورسٹی تھا!)۔

بلوچستان کے اس دور اندیش لیڈر نے اپنی قوم کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کی خاطر غریب بچوں کے لیے ہاسٹل کا بندوبست کیا جہاں قیام و خوراک کا انتظام جامعہ کی طرف سے تھا۔ وہاں طلبہ کو مفت تعلیم، لباس اور خوراک مہیا کی جاتی تھی۔

سواس نے بلوچ کانفرنس کی قراردادوں کے ٹھیک ساڑھے نو ماہ بعد اپنی اُن کاغذی قراردادوں کی زمینی بنیاد رکھی۔

مالی وسائل دوسری ضروری بات تھی۔اس سلسلے میں ''سردار'' یوسف نے اپنی جیب سے پچاس ہزار روپے اس کام پہ جھونک دیے۔(اُس زمانے کے پچاس ہزار!)۔

دوراندیشی اور جنون دیکھنا ہو تو اِس سیاسی ورکر اور مدبر کے اس قول کو پڑھیے؛

''میرے پاس مال ومتاع کی فراوانی ہے۔اگر میں اپنی تمام دولت بھی اپنی قوم پر خرچ کردوں اور میرے پاس قوم کی تعلیم واصلاح کے لیے کچھ بھی باقی نہ رہ جائے تو یقیناً اُس وقت میں ایک ایک بلوچ کے گھر پر صدا لگاؤں گا کہ خدا کے لیے میری جھولی میں کچھ ڈال دو تا کہ میں اپنے عظیم بلوچ فرزندوں کو منزلوں سے آراستہ کرسکوں''۔

مگر یہ واقعی ایک مسئلہ تو تھا۔اگر یہ پچاس ہزار روپے ختم ہو جاتے تو پھر کیا ہوگا؟۔رقم کی ترسیل کا کوئی مستقل ذریعہ چاہیے تھا۔چنانچہ اُس نے اپنی زرعی زمین کی کل پیداوار کا دسواں حصہ تعلیم کے لیے مختص کردیا۔

دو اور چیزوں کی سخت ضرورت تھی: ایک تو مصمم اور کمیٹڈ ٹیم چاہیے تھی، اور دوسری واضح حکمتِ عملی۔چنانچہ اس نے ایک زبردست ٹیم اکٹھی کی۔اس ٹیم کا سب سے بڑا نام مولانا عبدالکریم کا تھا جو پہلے تو ''الاسلام'' اور بعد میں ''میزان'' کوئٹہ کا ایڈیٹر رہا۔سو وہ جامعہ یوسفیہ کا ناظم بنا، ''ناظم جامعہِ یوسفیہ''۔مطلب یہ کہ وہ پورے علاقے میں تعلیم کے الگ اور مختص شعبے کا سربراہ تھا۔ایک اور مشہور عالم کا بھی نام ملتا ہے؛ حاجی کینجہ۔وہ ہرات افغانستان کا رہنے والا تھا۔

یوسف نے اپنے قبیلے کو حکم دیا کہ جس گھر میں ایک بچہ ہے وہ تعلیم حاصل کرنے کا پابند ہوگا۔اگر گھر میں ایک سے زائد بچے ہیں تو ان کے والد پہ یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ کم از کم اپنے دو بچوں کو تعلیم دینے کا پابند ہوگا۔ان کی تعلیم کے تمام اخراجات، کپڑے، کتابیں انھیں نواب مگسی سے مفت ملیں گی۔اور جس نے اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دی، ان پر جرمانہ ہوگا۔(20)

اب آیئے تعلیم کی حکمتِ عملی کی طرف۔اس جامعہ کا باقاعدہ ایک دستور العمل تھا،

باقاعدہ نصاب تھا اور باقاعدہ امتحانی نظام تھا۔جامعہ یوسفیہ کا نصاب جامعہ ملیہ دہلی جیسا تھا۔

اس جامعہ کا ''ابتدائی مدارس کا نصاب تعلیم'' یا تخیل، دستور العمل 1934 میں چھپا تھا۔ پمفلٹ چوالیس صفحوں پر مشتمل ہے۔

''ابتدائے مدارس'' کے تحت یوں لکھا ہوا تھا:

''نصابِ تعلیم کی تجویز فنِ تعلیم کا ایک اہم اور مشکل ترین معاملہ ہے۔اس کی عقدہ کشائی کے لیے ۔۔۔باوجود اختلافِ کوائف ملکی اور تباین (فرق) فضائے ادبی واخلاقی جامعہِ عزیزیہ اسلامیہ کے نصابِ تعلیم کی تطبیق جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے نصاب سے ہو جائے''۔

پمفلٹ میں ''تعلیم'' کے عنوان سے جامعہ کے اساتذہ سے خطاب کیا گیا ہے۔ابتدا یوں ہوتی ہے؛

''تعلیم کا زبردست مدعا تربیتِ اخلاق، اصلاحِ اعمال وعادات، تصحیح عقائد، متانتِ نفس اور حسنِ عمل ہے۔عالمِ بے عمل کو، مثل کو رِ مشعلہ دار اسی لیے کہا گیا ہے۔شیخ سعدیؒ کی اس رباعی سے انسان درسِ حکمت حاصل کرسکتا ہے:

علم چندانکہ بیشتر خوانی
چون عمل در تو نیست نادانی
نہ محقق شود نہ دانشمند
چار پائے بر او کتابے چند

اس حصے میں استاد کے فرائض بتائے گئے ہیں، پھر یہ کہ اُسے کس طرح طلبہ کی اصلاح کرنی چاہیے؟ اس کے مختلف طریقے درج ہیں، مثلاً:

''سچ کی عادت پیدا کرنے کے لیے سچ بولنے والے بچے کو انعام دیا جائے تا کہ دوسرے بچوں میں بھی سچ کی ترغیب اور رشک پیدا ہو۔ہم مکتب اور ہم جماعت بچوں میں باہمی محبت اور ہمدردی پیدا کرنی چاہیے۔اس کے لیے وقتاً فوقتاً کسی بیمار بچے کی عیادت کے لیے استاد کا مع اپنی جماعت کے طلبہ کے جانا مفید نمونہ رہے گا یا میدانِ کھیل میں کسی پیاسے بچے کو خود اپنے

ہاتھ سے پانی پلائے یا کسی چوٹ کھائے ہوئے بچے کو خود اٹھالے، اپنے دامن سے ہوا دے، اس کی دل جوئی کرے۔ اس طرح بچوں میں ہمدردی اور محبت پیدا ہوگی۔

''نماز کی پابندی میں بچوں کو پختہ کیا جائے۔ نماز سے ظاہر و باطن کی صفائی حاصل ہوتی ہے۔ اس سے بڑھ کر نماز کی تعریف بچوں کے دلوں میں یہ بٹھادی جائے کہ ''ان الصلوۃ تنہیٰ عن الفحشاء والمنکر''۔

''اس کام کے لیے صرف دینیات کا استاد خاص توجہ نہ کرے بلکہ تمام اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ مل کر ہر وقت اس فکر میں محو رہیں اور اس کی طرف خاص توجہ دے کر دینی و دنیوی سرخروئی حاصل کریں''۔

نصابِ جامعہ کی چند کتابیں یہ تھیں؛

1۔اردو قاعدہ ''مرتبہ محمد عبدالرحمٰن ضیا، خاص کوشش سے جامعہ کی ابتدائی جماعت کے بچوں کے لیے تیار کیا گیا تھا جو پچاس صفحوں پر مشتمل تھا۔

2۔''اردو کی پہلی کتاب درسیہ عثمانیہ'' مرتبہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) (مختلف جماعتوں میں مختلف حصے)

3۔''ہمارے نبی ﷺ''۔شائع کردہ جامعہ ملیہ دہلی، بطور اردو علم وادب۔

4۔''مخزنِ حساب'' (مختلف حصے مختلف جماعتوں میں) خواجہ دل محمد ایم اے

5,6۔''اتالیق'' (اچھی نظموں کا مجموعہ) اور رسالہ دینیات (سلسلہ وار) شائع کردہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

7۔''جغرافیہ عزیزیہ'' مرتبہ محمد عبدالرحمٰن ضیا۔

8۔''جغرافیہ بلوچستان'' مصنفہ شیخ عبدالصمد۔

9۔''گلدستہ قواعد'' مصنفہ محمد عبدالرحمٰن ضیا۔

10۔''پہاڑہ عزیزیہ'' مرتبہ ضیا۔

11,12۔''گلدستہ جغرافیہ'' (مختلف حصے) ''جغرافیہ ہندوستان''، مرتبہ محمد عبدالرحمٰن ضیا

13۔''جغرافیہ ہندو دنیا'' مرتبہ محمد دین، بی اے۔

14۔''چار یار'' مرتبہ الیاس مجیبی۔

15۔''کمک اردو'' مولوی محمد اسماعیل۔

16۔''سرکارِ دو عالم ﷺ (بطور تاریخ اسلام)۔

17۔''خلفائے اربعہ'' (بطور اردو ادب)۔

18۔''قرآن کریم'' کے ایک منتخب حصے کا ترجمہ، مرتبہ سعید انصاری، شائع کردہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

19۔''اچھی باتیں''، یعنی خلاصہِ حدیث، شائع کردہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

علاوہ ازیں جامعہ کے اس دستور العمل میں عمارات جامعہ، حاضری، دارالاقامہ، ناظر کے فرائض، جامعہ کا سال تعلیم اور تعطیلات، اوقات تعلیم جامعہ، فرائضِ مدرسین جامعہ، فرائضِ ناظرِ جامعہ، بچوں کی مرکزی دکان، کھیلیں، مہتم و ناظر جامعہ کے فرائض، وظائف، سالانہ جلسہ اور امیر الجامعہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔(21)

سہ روزہ ''ینگ بلوچستان'' کراچی نے 20 اکتوبر 1934 کی اشاعت میں مگسی صاحب کی ایک نظم چھاپی۔ عنوان تھا؛ ''جامعہ عزیزیہ جھل کے طلبہ سے''

شعاعِ علم سے روشن کرو تم اپنے سینے کو
تمھیں ہے ڈھونڈنا اِک گمشدہ قومی خزینے کو
عزیزی جامعہ ہے درحقیقت دولتِ نایاب
کچھ اس کے سامنے سمجھو نہ قاروں کے خزینے کو
وہ انمول صفت ہے یہ اسے اچھی طرح سیکھو
بنانا ہے تمھیں گوہر، بلوچوں کے پسینے کو
کرو صد جانفشانی سے سبق اسلام کے ازبر

اسی توشے کو لے کر چل سکو گے تم مدینے کو
چھپا کب تک رہے گا آہ! جھل کے تنگ گوشے میں
سرِ بازار لاؤ حسنِ ''یوسف'' کے خزینے کو

یوسف عزیز بذاتِ خود جامعہ میں معائنہ کے لیے جاتا، تعلیمی حالت کا جائزہ لیتا اور رائے بک میں عملی ترقی اور عام معیار کی بلندی کے لیے تجاویز قلم بند کرتا۔

یوسف علی خان نے جامعہ عزیزیہ میں ایک لائبریری قائم کی۔ اُس کی قائم کردہ اِس لائبریری میں مذہبی، سائنسی اور دیگر شعبوں پر مبنی کتابیں اور رسالے موجود تھے۔ وہ اکثر اس لائبریری کے وزٹ کرتا' رجسٹر چیک کرتا، کتب بین طالب علموں اور دیگر افراد کی تعداد دیکھتا' ان سے رابطہ کرتا۔ پڑھی گئی کتاب کے بارے میں قاری سے سوال وجواب اور کتاب سے اخذ معلومات شیئر کرتا۔ لوگوں سے ملتا اور انھیں کتب بینی کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتا۔

28 نومبر 1933 کے روزنامہ ''آزاد'' کا یہ ٹکڑا ایک باقاعدہ منظر پیش کرتا ہے:

''اُس وقت خاص جھل کے شہر میں پچاس ہزار روپیہ کی عمارت سکول و بورڈنگ ہاؤس اور مدرسین کوارٹرز تعمیر ہو رہے تھے۔ قریباً وہ تمام عمارات پایہ تکمیل کو پہنچ چکیں۔ 15 اکتوبر 1933 کو مرکزی سکول کی بنیاد نواب صاحب موصوف نے اپنے ہاتھوں سے رکھی۔ وہ ہفتہ بھر صبح سویرے طلبہ کو گھروں سے جا کر بلا لانے اور جمع کرنے کا کام کرتا رہا''۔

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ یوسف مگسی کے ایک رفیق عبدالصمد اچکزئی نے اسے بتائے بغیر 1933 کے اواخر میں اُس کے علاقے کا دورہ کیا۔ اور 3 دسمبر 1933 کے ''البلوچ'' میں یہ تاثرات لکھے۔

''۔۔۔جھل کے مقامی باشندوں کے علاوہ تمام بیرونی طلبہ اور یتامی وغربا کے لیے کھانا، لباس اور دیگر ضروریات بھی سردار صاحب مہیا کریں گے۔ سردار کی خواہش تھی کہ تعلیم کے ساتھ بچوں کو دستکاری بھی سکھلائی جائے۔۔۔اس وقت جَھل کے سکول میں 60 طلبا تھے''۔

لیکن ایک اور باوثوق ذریعے نے لکھا کہ اس نے: ''5 سے 9 سال کے بچوں کے لیے زبردستی تعلیم کا حکم جاری کیا۔'' (22)

بہرحال حکم دیا یا نہیں اہم اس لیے نہیں کہ وہ تو گھر گھر جا کر بچوں کو سکول داخل کروانے کی ترغیبیں دیتا تھا۔ ایسا شخص جو عوام کے دلوں کے گھر میں بستا ہو، کہاں کسی کے بچوں کو سکول سے باہر رہنے دیتا تھا۔

بعد میں اخبار الحنیف نے جامعہ کے طلبا کی قابلیت کے بارے میں یہ الفاظ لکھے:

''جامعہ کے اُس وقت کے طلبا جن کو صرف دو تین سال اس بہتی گنگا سے استفادہ کا شرف حاصل ہو چکا تھا، کی تحریریں ہمارے مشاہدہ میں آ چکی ہیں۔ اور ہم حیران ہیں کہ کیا یہ بھی ممکن ہے کہ پانچویں چھٹے درجے کا ایک طالب علم اس قدر روانی سے اپنے مفہوم کو بہترین الفاظ میں ادا کر سکتا ہے؟'' (23)

یوسف یہیں نہیں رکا۔ بلکہ اس نے دیگر دیہات میں بھی سکول قائم کیے۔ اس نے پنجک اور کوٹ یوسف علی میں پرائمری سکول جاری کیے۔

یہاں ہم جامعہ عزیزیہ میں اُس تعلیم کے آخری درجے یعنی امتحانات اور امتحانی پرچوں کے مندرجات دیکھ کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کریں گے کہ اس ساری محنت اور اخراجات کا حاصل کیا ہوا۔ یہاں ہمارا سورس ہفت روزہ ''بلوچستان جدید'' کراچی کا 16 جون 1934 کا شمارہ ہے:

''۔۔۔یہ واضح رہے کہ نواب محمد یوسف علی خان نے جامعہ کی بنیاد 5 اکتوبر 1933 کو اپنے مبارک ہاتھوں سے رکھی تھی جب وہ سردار ہو کر جھل آئے تھے۔ 5 اکتوبر 1933 سے 15 اپریل 1934 تک کے عرصہ میں جامعہ کے اندر جو تعلیم ہوئی ہے، یہ پرچہ اس تعلیمی کورس یا نصاب میں سے مرتب ہوئے ہیں۔۔۔

''پرچہ ''تاریخ''۔ وقت 2 گھنٹے

جماعت ابتدا سوم۔ نمبر 50

1۔ اصحابِ فیل کا واقعہ بیان کرو؟ کب ہوا، کہاں ہوا۔ قرآن شریف سے اس واقعہ کا استنباط کرو؟

2۔اپنے مذہب کے بانی کا مختصر حال بیان کرو؟ نیز یہ بھی بیان کرو کہ آپ (ﷺ) کے والد اور والدہ کا انتقال کب ہوا؟ والدین کے انتقال کے بعد آپ (ﷺ) کی پرورش کس نے کی؟

3۔بی بی خدیجہ الکبریٰ کا نکاح ہمارے نبی (ﷺ) سے کیوں کر ہوا؟ یا کیسے ہوا؟

4۔تاریخ کسے کہتے ہیں۔تاریخ سے کیا فائدے ہیں۔ثبوت دے کر بیان کرو؟

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔اس کا مطلب ایسی آسان عبارت میں لکھو کہ ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی سمجھ جائے؟ نیز یہ بھی بیان کرو کہ ہمارے نبی ﷺ نے دنیا میں رہ کر کیا کیا کام کیے؟

5۔نبی ﷺ پر درود وسلام بھیجنے کا قصہ قرآن شریف سے ثابت کرو۔نیز آپ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کے ثبوت میں قرآنی آیات پیش کرو؟

''پرچہ ''تاریخ''۔وقت دو گھنٹے

جماعت پنجم۔نمبر 50

حضرت محمد ﷺ کی پیدائش کا حال مفصل بیان کرو؟ اور صحیح تاریخ پیدائش کا حوالہ دو۔حضرت محمد ﷺ نے تجارت کب شروع کی؟ کیوں کر شروع کی؟ تجارت سے آپ کو کون سا ایسا فائدہ ہوا جس کو اگر تاریخی فائدہ کہا جائے تو بجا ہے۔آپ کی تجارت سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟

انجمن حلف الفضول (؟) کا مقصد کیا تھا؟ انجمن کہاں بنائی گئی۔اس انجمن کے مقاصد مفصل طور پر بیان کرو؟

خانہ کعبہ کی دیواروں کی تعمیر پر کون سا تاریخی واقعہ وقوع میں آیا؟ حجر اسود کو کونے میں کس نے لگایا۔اس کے متعلق مفصل بیان کرو؟

آپ ﷺ کو پہلا الہام کس وقت ہوا اور کہاں ہوا؟ اس کا آپ پر کیا اثر ہوا؟ اور پہلا الہام کیا تھا؟

بی بی خدیجہ الکبریٰ کون تھی۔پہلے الہام کے وقت بی بی صاحبہ نے حضرت رسول مقبول ﷺ سے کیا بیان کیا؟

ورقہ بن نوفل کون تھے؟۔الہام اول پر اس نے حضرت رسول مقبول ﷺ کو کیسے تسلی کرائی۔مفصل

بیان کرو؟

****

''بلوچستانِ جدید'' کراچی کے 16 مئی 1934 کا ایک اور ٹکڑا ملاحظہ کریں:

'' تیسری جماعت اور تاریخ کا پہلا پرچہ بلا مبالغہ نواب صاحب کے اس دعویٰ پر مہر توثیق ثبت کر رہا ہے کہ، آپ کی دس سالہ تعلیم کو یہاں انشاءاللہ چھ سال میں ختم کیا جائے گا''۔

اخبار آگے لکھتا ہے: ''ہم بھی مدرس رہے ہیں۔ہمیں بلوچستان کے رائج تعلیمی معیار کا خوب علم ہے۔ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ بلوچستان میں کہیں بھی اس شان وشوکت کا مدرسہ نہیں۔اس قسم کے پرچوں کو ہائی کلاس کے طلبا بھی حل نہیں کر سکتے۔ بلکہ اکثر مدرس بھی، وہ جو بی اے کی سند رکھتے ہیں، اس کے پرچوں کو حل کرنے سے یکسر معذور ہیں۔اس تعلیم اور پھر اسلامی تعلیم سے ملک وقوم کے بچوں کو آراستہ کیا جا رہا ہے''۔

4 اکتوبر 1934 میں سہ روزہ ینگ بلوچستان کا اداریہ بعنوان ''جامعہ اسلامیہ عزیزیہ اور جھل کا شاندار مستقبل'' ملاحظہ ہو:

''عرشیاں را صبحِ عید آں ساعتے
چوں شود بیدار چشمِ ملتے

''بھلا قدرت کا اس سے بڑھ کر اُن پر اور کیا احسان ہو سکتا تھا کہ اُن کو نواب محمد یوسف علی خان جیسے مردِ مجاہد کی قیادت نصیب ہوئی۔اور جس نے سرشمس جیسے انسان کی وزارت کو جس کے رگ وریشے میں جور واستبداد رچ چکا تھا۔اور جس کی بے پناہ مظالم سے ریاست کلات کے بچے بچے پر سکرات کا عالم طاری تھا، ایک ہی اولوالعزمانہ عملی اقدام سے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔اب اسی مکسی قبیلے کا فرد ذلت وتباہی کی آخری منزل تک پہنچ چکا تھا۔ ہر نیا قدم عزت وعظمت کی طرف اٹھ رہا ہے۔۔۔آپ نے اپنی قوم کو مہذب اور شائستہ بنانے کے لیے نصف لاکھ روپے کے ذاتی مصرف سے جامعہ عزیزیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی ہے۔ جہاں قوم کے بچے دینی اور دنیاوی تعلیم کے علاوہ علومِ جدید سے بھی خاطر خواہ طور پر بہرمند ہو رہے ہیں۔ جامعہ کی عنانِ نظامت مولوی

عبدالکریم جیسے خلیق اور پختہ کار معلم کے ہاتھوں میں ہے جن کے طفیل وہ اپنی فلاح کی خوش آئند مراحل کمال خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ طے کر رہا ہے۔ اس وقت جامعہ کا دستور العمل اور نصابِ تعلیم ہمارے سامنے ہے۔ برٹش بلوچستان اور کلات کے افسرانِ تعلیم آئیں اور تھوڑی دیر کے لیے اپنے افلاطونی دعوؤں کو ایک طرف رکھ کر دیکھیں کہ ایسی ہی تعلیم سے ایک قوم کے مستقبل کو امید افزا بنایا جاسکتا ہے''۔(24)

جامعہ عزیزیہ یوسف آباد کی شاخیں بڑھتی گئیں۔ 16 نومبر 1934 تک سنجیک کمبر، اور کھیرتر وغیرہ میں شاخیں کھل چکی تھیں (25)۔ کھیرتر والے برانچ میں امید کی گئی کہ تعدادِ طلبا اخیر نومبر تک 200 تک پہنچ جائے گی۔(26)

حد تو یہ ہے کہ جب اُسے جبراً لندن جلاوطن کیا گیا تب بھی اسے اپنے جامعہ عزیزیہ کا درد چین سے رہنے نہیں دیتا تھا۔ مگسی صاحب نے اُس جلاوطنی کی حالت میں بھی جامعہ کے ناظم کو خط میں یوں گڑگڑا کر اس تعلیمی ادارے کے دوام کی اپیل کی تھی؛

''.....میرا رواں رواں، میرا ذرہ ذرہ آپ کا مشکور ہے۔ باایں ہمہ آپ اپنے فرض سے اب تک آزاد نہیں ہوئے، جب تک جَھل میں تعلیمی معیار کو اس بلندی پر نہ پہنچائیں جہاں آپ کا پیارا یوسف.....اُسے لانا چاہتا تھا..... خدانخواستہ، خدانخواستہ اگر یہ سکیم برباد ہوگئی، رفتار کو گل محمد کے عہدِ جہالت کی حالت پر لایا گیا تو محبوب کو کہہ دو کہ یوسف، باوجود والد کی بے انتہا محبت کے انبار سینے میں چھپائے ہونے کے، اور باوجود اور حالات کے، خونِ جگر پی کر صبر اختیار کرے گا مگر جاہل، بزدل جَھل میں کبھی نہیں آئے گا''۔

یہ ایک سردار اور نواب کے الفاظ ہیں، جس کا انتقال ہوئے پون صدی سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اگر اِس سردار کے دوسرے سارے اوصاف و خدمات ہٹا بھی لیے جائیں، تب بھی وہ بلوچستان کی تاریخ میں محض اس لیے بلند ترین شخص کے طور پر پہچانا جائے گا کہ اس نے عوام کو شعور و آگہی کا عظیم ہتھیار عطا کیا۔ اُس نے اِس کام کے لیے نہ صرف علمی اور ادبی خدمات انجام دیں بلکہ اس کے لیے عملی اقدام بھی کیے۔ مقصد تھا: جاہلانہ نظام کے صدیوں سے قائم مضبوط قلعے کو ڈھا دینا،

اور اس کی جگہ ایک نئی دنیا، ایک مترقی اور قابلِ رہائش دنیا قائم کرنا۔

وہیں لندن ہی سے یہ جلاوطن، جامعہ کے ناظم مولانا عبدالکریم کے نام ایک خط میں اپنے اِحساسات کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے؛ ''مولانا مجھے یقین ہے کہ آپ میری غیر حاضری میں اپنے فرض کو میری موجودگی کے مقابلے میں دگنا اہم سمجھ کر حق وصداقت کے اس پودے کی تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے۔ خواہ اس کی آبیاری کے لیے خونِ جگر ہی بہانا پڑے۔ ایسا نہ ہو کہ بادِ صرصر کے تھپیڑے اپنا کام کر جائیں اور مہینوں کی جدوجہد کا حاصل ایک لمحۂ غفلت کی نذر ہو جائے۔''

اُس نے انگلینڈ کے تعلیمی اور سماجی اداروں کے مطالعہ کے پیشِ نظر اپنے قیام کے دوران وہاں بلوچوں کے لیے ایک دارالاقامت بنانے کی تجویز کی تا کہ جب بلوچ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے باہر جائیں تو اس ہاسٹل میں قیام پذیر ہوسکیں۔ ہاسٹل کے اخراجات اس نے خود برداشت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

***

13۔ شاندار ترین خراجِ عقیدت

24 ستمبر 1933 کے اخبار ''البلوچ'' میں صحرائی سروری سابق مدیر مسئول ''چاند'' الآباد کا ''نواب محمد یوسف علی خان عزیز سے خطاب'' کے عنوان سے یہ نذرانۂ عقیدت چھپا؛

''اے میرے نادیدہ دوست، میرا اسلام تجھ تک پہنچے۔ بلوچستان کے رہبرِ اعظم! تو نے بلوچ قوم کے شیرازۂ منتشر کو منضبط کیا۔ تو نے بڑی بڑی توند والے سرمایہ داروں کی باطل حقیقتوں کا انکشاف کیا۔ قومِ بلوچ کو پیامِ بیداری دینے والے بطلِ جلیل! ہم نے تیرے پیام کو روح کے کانوں سے سُنا اور دل کی گہرائیوں کے ساتھ اس کا احترام کیا۔ تیری ان تھک کوششوں سے قوم بیدار ہو چکی ہے۔ تجھے قدرت نے بے لوث دل عطا کیا ہوا ہے۔ تیرے دل کی کروٹوں میں اسلام، قوم اور وطن کی محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے!

''پنجاب ظفر پر نازاں ہے، بنگال کی فضائیں آزاد کے وہی ترانوں سے گونج رہی ہیں،

سرزمینِ سرحد میں غفار نے نعرۂ حق بلند کیا اور میری قوم کے قائد! تو نے ہزاروں برس گزرنے کے بعد بلوچستان میں پیدا ہو کر اپنی قوم کو ایک نیا پیغام سُنایا!!

تیری محویت پر بعض یارانِ نجد نازاں ہیں، بعض متردد اور بعض متبسم!!

''تو اُن ناگواریوں کو، جو تیری راہِ عمل میں حائل ہو جاتی ہیں، سودائے ازلی کی قوتوں سے دُور کر دیتا ہے اور دیوانہ وار ہونٹوں سے بُت خانوں کو نغمۂ درد سے چھیڑتا ہوا، خدمتِ قوم کے عشق میں والہانہ رجز پڑھتا ہوا، اپنی منزلِ مقصود کی طرف چلا جا رہا ہے۔ جاہل تجھے ''دیوانہ'' کہتے ہیں مگر اس ''دیوانگی'' میں بھی ''فرزانگی'' کا راز مضمر ہے۔

''مفادِ ذاتی پر مفادِ قومی کو ترجیح دینے والے شیدائے قوم! ہم مدتیں گزرنے کے بعد بھی تیری قربانیوں کو فراموش نہ کر سکیں گے۔ تیرے قومی ترانوں نے زاہدانِ عباپوش کی طرح زاہدانِ بادہ نوش کو بھی مسمور کر لیا ہے۔

''اے مادرِ گیتی کے مایۂ ناز فرزند! صبح گجردم! کوہسار کی لڑکیاں چکی کی گُھر گُھر کے ساتھ تیرے ترانوں کو الاپتی ہیں۔ ان کی لطیف و مہین آواز مسافرانِ صبح کو نغمۂ بیداری سُناتی ہوئی سر بفلک پہاڑوں سے ٹکرا کر ہوا کے سرد و نرم جھونکوں میں غائب ہو جاتی ہے۔ پنگھٹ پر جب دوشیزۂ دہقانی پانی بھرنے کے لیے اپنی مٹکی لے کر آتی ہے تو اپنی البیلی سکھیوں سے تیرا ذکر کرتی ہے۔ پھر سب تیری قربانیوں سے متاثر ہو کر تیرے گیت گاتی ہیں اور کہتی ہیں، ''بلوچ قوم کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو بھنور سے نکال کر ساحل تک صحیح و سالم پہنچانے والا ناخدا آ پہنچا''۔

''وہ ایک دیپک ہے اس کے آتشیں راگ نے دلوں میں آگ لگا دی ہے۔ وہ غم رسیدوں کا دلِ بے قرار ہے۔ وہ ریگستانی آبشاروں کی روانی ہے۔ وہ ایک سرمستِ ازلی ہے۔

''اس کے پیامِ بیداری نے ہماری خفتہ روح کو بیدار کر دیا ہے۔ بلوچ قوم صدیوں سے اپنی قومی روایات کو بھول چکی تھی مگر اُس نے عہدِ گزشتہ کی یاد پھر تازہ کر دی!۔

''سپہ سالارِ قوم! اپنا پیغام سُناتا جا۔ اور اپنی بانسری پر نغمۂ بیداری گاتا جا۔ اگر سرمایہ دار تیرے پیغام کو سُننا نہیں چاہتے تو نہ سہی! مگر بلوچ کی غربت کدہ کی ویرانیاں تیرے نغمات سے

معمور ہیں۔ وہ تیری آواز پر لبیک کہنے کا منتظر ہے! اُنھیں تاریکی، جہالت کے عمیق ترین غار سے نکال کر شاہراہِ ترقی پر گامزن کر۔''

14۔ حیدرآباد کنونشن

جمہوری اخبارات حیدرآباد کانفرنس کو بہت خوش آئند قرار دیتے ہوئے اس کا خیر مقدم کر رہے تھے۔

ہمیں 8 دسمبر 1933 روزنامہ انقلاب لاہور کا اداریہ یہاں نقل کرنے دیں جو میرے خیال میں بہت اہم ہے:

''ہر مسلمان بلکہ ہر منصف مزاج انسان کا دل یہ دیکھ کر مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے کہ آخر مدتِ دراز کے بعد بلوچستان کے باشندوں میں بھی زندگی اور بیداری کی لہر پیدا ہو رہی ہے۔ اس سے پیشتر اہلِ بلوچستان کی ایک کانفرنس منعقد ہو چکی ہے اور اب پھر اعلان کیا گیا ہے کہ 26، 27، 28 دسمبر کو حیدرآباد سندھ میں ہز ہائینس میر صاحب خیر پور کی زیر صدارت ایک آل انڈیا بلوچ کانفرنس کا انعقاد قرار پایا ہے۔ اگرچہ ابھی بلوچستان کی حدود کے اندر تحریر و تقریر کی آزادی مفقود ہے لیکن سندھ میں بلوچستانیوں کے ہفتہ وار اخبارات بھی شائع ہو رہے ہیں، خدامِ قوم مل کر بیٹھتے ہیں۔ اپنی قوم کی ترقی و تعالی کی تجویزیں سوچتے ہیں اور کانفرنسوں کے ذریعہ سے بھی اپنے خیالات قوم تک پہنچا رہے ہیں۔ بلاخوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس تمام حرکت و بیداری کا سہرا نواب زادہ محمد یوسف علی خان مگسی کے سر ہے۔ جو تاریک خیالی اور جہالت کے اس وسیع خارزار میں جسے بلوچستان کہتے ہیں، عروج و ترقی کے ایک گلِ نورس کا حکم رکھتے ہیں۔ بلوچستان کے سردارانِ قبائل رجعت پسندی، جہالت، جمود اور وحشت کے اعتبار سے دنیا جہاں میں ضرب المثل تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انھی لوگوں میں سے ایک ایسا فرد پیدا کر دیا جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی قوم کی فلاح و بہبود کے لیے سعی و جہد میں بسر ہو رہا ہے۔ اور یہ اسی خلوص اور جذبۂ صادق کا اثر ہے کہ آج بلوچستان کے گوشے گوشے میں زندگی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔

''۔۔۔ہمیں یقین ہے کہ اب بلوچستان کا ایک ایک فرد احساسِ ذلت سے بہرہ مند ہو چکا ہے ۔اپنی حالت کو درست کرنے کے لیے مضطرب و بے قرار ہے۔اگر ہمارا یہ خیال صحیح ہے تو بلوچستان کے ہر فرزند کا فرض ہے کہ آنے والی کانفرنس میں شامل ہو، ذاتی مناقشات اور قبائلی اختلافات کو طاق پر رکھ دے اور اپنے بھائیوں کے ساتھ متحد و متفق ہو کر قوم کی ترقی و بیداری کی تحریک کو تقویت پہنچائے ۔ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کی آنکھیں اب اپنے بلوچ بھائیوں کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اور وہ نہایت بے تابی سے اس وقت کا انتظار کر رہے ہیں جب بلوچستان بھی ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح ترقی کی راہ پر گامزن ہو کر اسلامی ہند کے لیے طاقت وقوت کا باعث ہوگا۔اللہ تعالیٰ ہمارے بلوچستانی بھائیوں کو مخلصانہ خدمتِ ملت کی توفیق عطا فرمائے''۔

***

یوسف عزیز مگسی نے انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کلات اور خود اے جی جی کو اِس کانفرنس میں شرکت کی دعوت بھیجی ۔ جس کا جواب پولیٹیکل ایجنٹ قلات نے 23 دسمبر 1933ء کو لکھا۔ میر صاحب کا خط تو میں حاصل نہ کر سکا مگر انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کا جواب اُن جاسوسی اور خفیہ دستاویزات میں ملی جو بلوچستان آرکائیوز میں محفوظ ہیں۔ (مجھے اس کی ایک کاپی عبدالقادر رند کے جمع کردہ خزانے سے بھی ملی)۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے اپنے خط کی کاپی ایجنٹ ٹو دی گونر جنرل بلوچستان کو بھی بھیجی تھی۔

خط یوں ہے:

''میں آپ کے 9 دسمبر کے خط کی وصولیابی کی اطلاع شکریہ کے ساتھ دے رہا ہوں۔ جس کا جواب اُس وقت نہ دے سکا اس لیے کہ میں اے جی جی کے ساتھ لسبیلہ کے دورہ پر تھا۔ میں اُن بہتریوں اور اصلاحات کے بارے میں سننا چاہتا ہوں جو آپ اپنے تمن میں متعارف کر رہے ہیں۔اور اُس موقع کو خوش آمدید کہوں گا جب خود دیکھوں جو کچھ آپ کر رہے ہیں۔ میں پُر امید ہوں کہ ان سردیوں میں سبی سے جَھل آپ کے پاس آؤں گا۔

''مجھے اے جی جی کی طرف سے بھی اُس خط کی وصولیابی کی اطلاع دینے کو کہا گیا جو آپ نے انھیں لکھا تھا۔ جہاں تک اس ماہ کے اواخر میں حیدرآباد میں آل انڈیا بلوچ کانفرنس اٹینڈ کرنے کی آپ کی تجویز کا تعلق ہے تو مسٹر کیٹر نے مجھے آپ کو اُس قول کے یاد دلانے کا کہا جو آپ نے ہز ہائی نس مرحوم خان (خان اعظم خان) کو دی تھی جب آپ کو سردار مقرر کیا گیا تھا۔ وہ یہ تھی کہ آپ اپنے تمن سے باہر کے معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔اس کا یقیناً یہ مطلب تھا کہ آپ بلوچستان سے باہر سیاسی تحریکوں کی سرگرم مدد نہیں کریں گے ۔ اب آل انڈیا بلوچ کانفرنس کو کسی صورت میں بلوچستان کی تحریک نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ مکمل طور پر پنجاب اور سندھ میں ابتدا اور منظّم ہوئی ہے ۔اور ماسوائے آپ کے اور چند دیگر کے بلوچستان میں ایک شخص بھی اس سے دلچسپی نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کے برعکس مقبولِ عام احساس بلاشبہ دوسرے صوبوں کی مداخلت کے خلاف ہے۔

''اس سلسلے میں مسٹر کیٹر یہ سننے میں دلچسپی رکھتے ہیں کہ آپ حیدرآباد کانفرنس میں اپنی حاضری کے بارے میں فارن سیکریٹری سے بات کریں ۔مگر وہ واضح کرتا ہے کہ مسٹر مٹکاف کے ساتھ نجی گفتگو کے دوران ادا کیے گئے ریمارکس کسی صورت میں اے جی جی کی ایک ایسی راہ پہ منظوری نہ ہوگی جس سے آپ نے پہلے ہی بچنے کا واضح طور پر وعدہ کر رکھا ہے''۔

خان عبدالصمد اچکزئی نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں بھی اس آمرانہ طرز کا تذکرہ کیا:

''کانفرنس کے آغاز سے چند گھنٹے قبل نواب یوسف عزیز مگسی نے مجھے بلایا اور پولیٹیکل ایجنٹ کلات کا ایک خط دکھایا جس میں مگسی صاحب کو تنبیہہ کی گئی تھی کہ وہ کانفرنس میں شرکت کرنے سے باز رہے۔''(27)

مگسی صاحب نے کانفرنس میں شرکت کی خاطر سرداری تک چھوڑنے کی دھمکی دے دی۔ یوسف اسی جوش وخروش کے ساتھ بلوچ کانفرنس کے اس سالانہ سیشن کی انتظام کاری، شرکت داری، مالی کفالت، اور دانشورانہ پہلوؤں میں نمایاں ترین شخص ہی رہا۔

آل انڈیا بلوچ کانفرنس کا یہ دوسرا سالانہ جلسہ حیدرآباد ڈاک بنگلہ کے قریب منعقد ہوا۔

اس سہ روزہ سالانہ جلسے میں سیاسی کارکن، دانش ور، اور عام عوام علاقے کے بڑے بڑے بلوچ زمیندار شامل ہوئے۔ کانفرنس میں پارٹی کے بلوچستان، سندھ اور ڈیرہ غازی خان کے منتخب ڈیلیگیٹس نے شرکت کی۔

بلوچ کانفرنس کے حیدرآباد سیشن کے پہلے ہی دن یعنی 26 دسمبر کو ''محراب گردی'' نامی کتابچے کی کاپیاں تقسیم کی گئیں۔ اس قدر بولڈ اور بہادرانہ مؤقف بعد کی پوری بلوچ تاریخ میں شاید ہی ملے۔ اس قدر واشگاف، اس قدر دبنگ، اس قدر برحق اور اس قدر بے خطر!۔

واضح رہے کہ بلوچ تاریخ میں ایک اور دلچسپ ترین واقعہ بھی انھی کانفرنسوں میں ہی ہوا تھا، اس کی مثال بھی بعد میں نہیں ملتی۔ ہوا یوں کہ پچھلے برس کی بلوچ کانفرنس (1932ء) منعقدہ جیکب آباد کے لیے نواب محراب خان تمندار بگٹی قبیلہ نے گراں قدر چندہ یوسف عزیز خان کو دیا تھا لیکن جب بگٹی قبیلہ کے ایک وفد نے نواب کے مظالم کے خلاف یوسف علی خان کو اپنی فریاد پہنچائی تو یوسف علی خان نے سردارانہ تعلقات کی پرواہ کیے بغیر مظلوم بگٹی قبائلیوں کی عملی حمایت کا اعلان کیا اور نواب محراب خان بگٹی کو اُس کا عطا کردہ عطیہ بھی واپس کر دیا اور کہا کہ نواب بگٹی کی طرف سے یہ چندہ درحقیقت رشوت ہے تاکہ میں اور تنظیم، مظلوم بگٹیوں کی مدد نہ کر پائیں۔

انگریز جاسوسی رپورٹوں میں حیدرآباد جلسے سے مگسی صاحب کی تقریر کا بھی ذکر ہے جس میں اس نے بلوچستان میں اصلاحات کے لیے کام کرنے کو کانفرنس کی سب سے بڑی ذمہ داری قرار دیا۔ اس نے سرکار سے بلوچستان میں تعلیم پھیلانے کا مطالبہ کیا۔ نیز بلوچستان کو آئینی صوبہ بنانے کا مطالبہ کیا (28)۔۔۔ کاش اُس کی تقریر کا مکمل متن مل جائے!۔

کانفرنس میں حسبِ سابق روزانہ رہنماؤں کی تقریریں ہوتی تھیں، ممتاز افراد اور تنظیموں کے پیغامات پڑھے جاتے تھے۔ اور ہر روز کے اختتام پر اُس روز کی قراردادیں پیش اور منظور کی جاتی تھیں۔

اس سہ روزہ سیشن میں کل ملا کر 40 کے قریب قراردادیں منظور ہوئیں۔

بلوچ کانفرنس کی قراردادیں

* انڈیا کی بلوچ کمیونٹی سے عموماً اور سندھ کے بلوچوں سے خصوصاً اپیل کی جاتی ہے کہ وہ ہر ضلع میں کمیونٹی کی تعلیمی، معاشی، سماجی اور سیاسی ترقی کے لیے بلوچوں کے انجمن بنالیں جو کہ آل انڈیا بلوچ کانفرنس سے الحاق کریں۔
* اپنے مطالبات میں بلوچستان کے لیے اصلاحات کے معاملے کو شامل کرنے پر آل انڈیا مسلم کانفرنس کا شکریہ ادا کیا گیا۔
* کانفرنس کے آئین پر نظرِ ثانی کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس کے ممبران میں نواب یوسف علی مگسی، میر اللہ بخش ٹالپر، خان عبدالصمد اچکزئی، غلام قادر وکیل، علی محمد عطا محمد شامل کیے گئے۔
* کلات سٹیٹ حکام سے سٹیٹ کے اُن زمینداروں کو مرکزی جرگے میں نمائندگی دینے پر زور دیا گیا جو لینڈ یونیو دے رہے ہیں۔
* بلوچستان اینڈ آل انڈیا بلوچ کانفرنس کا یہ سیشن جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کے اس رویے کو، جس کے تحت بلوچستان کو ایک الگ صوبے کے بطور بنانے سے انکار کرنے کو مایوس کن، افسوس ناک اور نامناسب سمجھتا ہے۔ اور سوچتا ہے کہ بلوچستان کے عوام کے جذبات کو اس رویے سے ٹھیس پہنچی ہے۔ کانفرنس انڈیا کے دوسرے صوبوں کی طرح اصلاحات کے فوائد سے مستفید ہونے کو بلوچستان کا پیدائشی حق سمجھتی ہے۔ یہ کانفرنس گورنمنٹ آف انڈیا اور برٹش گورنمنٹ سے درخواست کرتی ہے کہ وہ انڈیا میں بلوچ کمیونٹی کے جذبات کو مزید زخمی نہ کرے اور اس مطالبہ کو مان کر جلد از جلد بلوچستان میں اصلاحات نافذ کرے۔
* ممبروں کو کانفرنس کی صوبائی شاخیں قائم کرنے کی ہدایت کی گئی۔
* حکومت سے کراچی میں لیاری کواٹرز میں ایک انگلش سکول کے قیام کا مطالبہ کیا گیا۔
* بلوچستان کے حکام سے عبدالصمد خان اچکزئی کو بلوچستان میں ایک اخبار نکالنے کی اجازت دینے کا مطالبہ کیا گیا۔

* ایک بلوچ کالج شروع کرنے کے لیے بلوچ کمیونٹی کو ایک لاکھ روپے جمع کرنے کی اپیل کی گئی۔

* خان آف قلات سے درخواست کی گئی کہ وہ مسلم عورت کی وارثت میں حق دینے کے انتظامات کرے۔

* خان قلات پہ اس کے علاقے میں سکولز کھولنے پر زور دیا گیا۔

* حکومت سے سندھ پولیس میں بلوچوں کو بھرتی کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور ملٹری کالج میں بلوچ کمیونٹی کو سہولتیں دینے کا مطالبہ کیا گیا۔

* نواب خاران اور دیگر سرداروں سے اُن کے علاقوں میں سکولز کھولنے کا مطالبہ کیا گیا۔

* ایران کے بادشاہ رضا شاہ پہلوی سے درخواست کی گئی کہ کراچی اور سندھ میں ایرانی بلوچ مہاجروں کو واپس ایران جانے کی اجازت دے۔

* ایک قرارداد خان عبدلصمد خان نے اصلاحات بلوچستان کے متعلق پیش کی۔ آپ نے مطالبہ کیا کہ حکومت کو بلوچستان میں فوراً آئینی اصلاحات نافذ کرنی چاہئیں۔

* یہ کانفرنس ارکان کو اختیار دیتی ہے کہ وہ کانفرنس کی مقامی ضرورتوں کے لیے صوبہ جاتی شاخیں قائم کریں۔

* خان قلات پر زور دیا گیا کہ وہ مال گزاری ادا کرنے والے زمینداروں کو شاہی جاگیروں میں نمائندگی عطا فرمائیں۔

* یہ کانفرنس مقامی حکومت بلوچستان کی اس روش پر اظہار رنج وملال کرتی ہے کہ اس نے بلوچستان میں اخبارات جاری کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا اور حکومتِ ہند سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اس معاملہ میں مداخلت کرے اور حکومت بلوچستان کو حکم دے کہ وہ اخبارات جاری کرنے کی اجازت دے دے۔

* یہ کانفرنس ایجنٹ گورنر جنرل سے درخواست کرتی ہے کہ پسنی اور مکران کی دیگر بندرگاہوں کی نصف آمدنی کے متعلق خشکی کے جائز مطالبہ پر ہمدردانہ غور کریں تا کہ ہر حق دار شخص کو حکومت قلات کے ساتھ گذشتہ معاہدہ کے مطابق جائز حصہ مل سکے۔

* یہ کانفرنس سرداروں کے اس رواج کو کہ ترکہ میں مستورات کو حصہ نہ دیا جائے، شرعِ اسلام کے خلاف سمجھتی ہے۔ اور اے جی جی اور خان قلات سے درخواست کرتی ہے کہ اس قسم کے منافی شرعِ اسلام رواج کو بلوچستان جیسے اسلامی ملک میں بند کر دیں۔ نیز یہ کہ بلوچستان کی خواتین کے حقوق اس قسم کے ناجائز قوانین کی زد سے محفوظ رکھے جائیں۔(29)

اس کانفرنس میں قرار پایا کہ جماعت کا آل انڈیا مسلم کانفرنس سے الحاق کیا جائے۔ اور مختلف علاقوں میں اس کی شاخیں قائم کی جائیں۔

آل انڈیا بلوچ کانفرنس کی اگلے سال کے لیے کابینہ منتخب کی گئی:

صدر:	حاجی میر حسین بخش ٹالپر
نائب صدور:	1۔خان عبدالصمد خان اچکزئی
	2۔نواب یوسف علی مگسی
	3۔خان محمد خان
	4۔اللہ بخش خان گبول
جنرل سیکرٹری:	وکیل غلام قادر
جوائنٹ سیکرٹریز:	1۔علی محمد عطا محمد سندھ
	2۔محمد ایوب اچکزئی
پبلسٹی سیکریٹری:	عبدالعزیز کرد
فنانس سیکریٹری:	بندہ علی

اسی دن پارٹی کے لیے 120 ممبروں کی ایگزیکٹو کمیٹی بھی منتخب کی گئی۔ جس میں 30 ممبر بلوچستان کے تھے، کراچی اور حیدرآباد ضلعوں کے دس دس ممبر، سکھر دادو اور لاڑکانہ کے پانچ پانچ ممبر، تھرپارکر کے 12، جیکب آباد اور خیرپور سات سات، نواب شاہ 9، پنجاب سے 14 ممبر، ایرانی بلوچستان سے دو، اور دیگر صوبوں سے چار ممبرز۔

اسی طرح اگلے ایک سال تک کے لیے پارٹی کی ایک پندرہ رکنی ورکنگ (مرکزی) کمیٹی کا اعلان ہوا؛ اللہ بخش نواب شاہ، بخشان خان نوشکا ئڑیں حیدرآباد، ابراہیم خان نواب شاہ، شہباز خان نوشیروانی، محمد اسماعیل اچکزئی، محمد امین کھوسو، محمد حسین عنقا، خیر محمد چانڈیو حیدرآباد، اللہ داد خان تھرپاکر، مراد بخش مری نواب شاہ، خیر محمد مری نواب شاہ، فتح خان حیدرآباد، عبدالغفور کراچی، پیر بخش شہداد زئی کراچی، رسول بخش نواب شاہ۔

میر یوسف علی خان عزیز بلوچ نے تقریر کی۔ مقرر نے میرِ صاحب خیر پور کے اس بیان کو رد کر دیا کہ فرنٹیئر ریگولیشن ایک مفید قانون ہے۔ اور بتایا کہ قانون مذکور ملک کی بے چینی دور نہیں کر سکتا۔ بلکہ حکومت کا فرض ہے کہ عوام میں تعلیم کے ذریعہ ایسی فضا پیدا کرے کہ ایسے سخت قانون کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کانفرنس کا ابتدائی وانتہائی مقصد بلوچستان کے لیے کامل آئینی حکومت حاصل کرنا ہے۔(30)

عبدالصمد اچکزئی نے 1934 میں اپنے عدالتی بیان میں حیدرآباد کانفرنس کے بارے میں یوں کہا تھا:

''اس لیے اُس سال حکومت کو یقین تھا کہ گزشتہ تمام سال کے خلاف پروپیگنڈہ اور سختیوں کی وجہ سے امسال کانفرنس میں بلوچستان کے نمائندہ شامل نہ ہوں گے بلکہ وہ بیرونی بلوچوں کی جماعت بن کر رہ جائے گی۔ مگر جب اس کے بالکل برخلاف، اور باوجود کانفرنس کے اجلاس کے یہاں سے بہت دور ہونے کے، اور پھر رمضان شریف کے مہینہ میں جس میں ہندوستان کی بڑی بڑی مسلم جماعتیں بھی اپنے اجلاس کے انعقاد سے گھبرایا کرتی ہیں، اس کا اجلاس نہایت شاندار طریقہ پر منعقد ہوا جس میں بلوچستان کے ہر ضلع اور تحصیل کے نمائندے سالِ گزشتہ سے دوچند تعداد میں شامل ہوئے۔ تب حکومت کو لازماً تحریک کے بظاہر چلانے والوں پر ہاتھ ڈالنا پڑا''۔(31)

ریفرنسز

1۔ کھوسہ، محمد امین۔ نصرت۔ کراچی۔ 5 جون 1957

2۔ عامر وامین۔۔۔ صفحہ 103

3۔ مگسی، دھنڑیں بخش۔ ماہنامہ سنگت کوئٹہ، جولائی 2019

4۔ یوسف زئی۔۔۔ یادداشتیں۔ صفحہ 6

5۔ یوسف زئی۔۔۔ یادداشتیں۔ صفحہ 28

6۔ مگسی، یوسف عزیز۔ تکمیلِ انسانیت۔۔۔ صفحہ 14

7۔ کوثر،.....مکاتیب، صفحہ 23

8۔ مرید حسین۔ صفحہ نمبر 54

9۔ البلوچ، کراچی۔ 17 ستمبر 1932۔ صفحہ 6

10۔ سید، کامل القادری ''مگسی نمبر'' پر ایک نظر۔ صفحہ نمبر 6

11۔ روزنامہ زمیندار۔ لاہور۔ 5 اگست 1933

12۔ مرید حسین خان۔ جغرافیہ علاقہ مگسی و تاریخ حالات قوم مگسی۔ لاہور۔ 1939۔ صفحہ 27

13۔ البلوچ۔ 3 دسمبر 1933۔ صفحہ نمبر 4

14۔ کھوسہ، امین۔ ریاست جہل میں اصلاحات۔ روشن ضمیر نوجوان سردار کا قومی جوش۔ ہفت روزہ البلوچ، 3 دسمبر 1933

15۔ مگسی، عامر وامین۔ 2010۔ علامہ آئی آئی قاضی اکیڈمی، میہڑ۔ صفحہ 110

16۔ کھوسہ، محمد امین۔ بلوچستان جدید۔ یکم مئی 1934 صفحہ 9

17۔ سروری، منشی صحرائی۔ نجات کراچی۔ 4 مئی 1935۔ صفحہ 7

18۔ البلوچ۔ 3 دسمبر 1933

19۔ الحنیف۔ فروری 1937۔ صفحہ 77

20۔مگسی ،دھنڑیں بشک ۔ماہنامہ سنگت کوئٹہ۔ جولائی2019

21۔نقوشِ بلوچستان،صفحہ 144

22۔مگسی ،عامر وامین مگسی قبیلو۔2010علامہ آئی قاضی اکیڈمی ،میہڑ۔صفحہ 103

23۔الحنیف ۔فروری1937،صفحہ 77

24۔اداریہ،سہ روزہ ینگ بلوچستان ،کراچی ۔4اکتوبر 1934

25۔سہ روزہ ینگ بلوچستان ،کراچی ۔16نومبر 1934

26۔سہ روزہ ینگ بلوچستان ،کراچی ۔20نومبر 1934

27۔اچکزئی ،اودل سمد خان ۔زماژونداوژوندون ۔2007۔۔جلد نمبر 3۔صفحہ 59

28۔4جنوری 1934ءکوایس پی کوئٹہ پشین اور سبی کی طرف سے پولٹیکل ایجنٹ کوئٹہ کو بھیجا گیا میمورنڈم ۔بلوچستان آرکائیوز

29۔خان،غلام قادر۔روزنامہ انقلاب ،9مارچ1934ء

30۔خان،غلام قادر۔روزنامہ انقلاب ،9مارچ1934ء

31۔اچکزئی،عبدالصمد خان ۔عدالتی بیان ۔بلوچستان جدید کراچی 8 مئی 1934

چوتھا چیپٹر

یوسف مگسی کا متبادل نظام

میر یوسف عزیز مگسی کے نظریاتی سفر میں ارتقائی منازل خواہ جو بھی آتی گئیں اُن سب میں ایک قدر مشترک تھی: وہ نسلی امتیاز، قومی بالادستی اور رنگ ونسب کی برتری کو نہیں مانتا تھا۔ وہ دقیانوسی سماجی قیود اور فرسودہ پابندیوں کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ یوسف کی آئیڈیالوجی اعلیٰ انسانی اقدار اور بلند اخلاقی معیار پہ قائم تھی۔ اس کا نظریہ انسان اور انسانیت سے پیوست تھا اور انسان کے قول و فعل کو عمل کی کسوٹی پر پرکھتا تھا۔

گو کہ اس کا گراؤنڈ قبائلی تھا۔ اس کا سماج روایتی، نیم جاگیردارانہ اور پسماندہ تھا۔ مگر وہ اسی مشکل زمین پہ کھڑے ہو کر انسانوں کو بیدار کرنے کی کوششوں میں مصروف رہا۔ اور اس نے ایسے لوگ تلاش اور تعمیر کر لیے جن کے فعل و عمل اچھے تھے۔ جن کے فکر و عمل میں مطابقت تھی۔ جو اخلاق و کردار کے انمول نمونے تھے اور جو ہر لحاظ سے مثالی انسان تھے۔

ہم اُس کی فکر کو پانچ ستونوں پہ استوار دیکھتے ہیں۔

1۔ اسلام

2۔ نیشنلزم

3۔ سامراج دشمنی

4۔ فیوڈلزم مخالفت

5۔ سوشلزم

1۔ اسلام

یوسف مگسی ایک زبردست اسلام دوست تھا۔ اُس کی شاعری، مضامین، افسانہ، خطوط اور تقاریر اسلام سے کمٹ منٹ سے سرشار ہیں۔ سچا اور سُچا مسلمان۔ وہ سیاست، معیشت اور اخلاقیات میں اسلام کے بھرپور رول پہ زور دیتا تھا۔ بالخصوص سیاست میں۔ وہ سرداری نظام اور اُس کے رسوم کے مقابلے پر اسلام کے اصولوں کو لاتا تھا۔ اُس نے اسلام میں جو خوبیاں دیکھیں وہ یہ ہیں؛ ''اسلام، جس کی وسعت میں قومی، وطنی، نسلی اور لسانی معتقدات سب کے سب خوابِ پریشان ہو کر رہ جاتے ہیں اور جس کا معیار انسانیتِ کامل کا حصول اور نوعِ انسان ہیں۔ اتحاد و یگانگت کی روح پھیلانا ہے اور اپنے ہم مذہب رہنمایانِ قوم کی مخالفت اور حکومت کی شکوک افزا روش کے باوجود شرابِ عشق سے مست ہے۔ مواقع سے بے نیاز اپنے مسلک پر ثابت اور صراطِ مستقیم پر چلا جانا اگر کوئی دلفریب حقیقت رکھتے ہیں تو میں مستقبل کے لیے پرامید ہوں کہ انشاءاللہ یہ سہرا بلوچوں کے ہی سر پر ہوگا''۔

یوسف عزیز براہِ راست قرآن مجید اور سنت رسول کریم ﷺ کی طرف رجوع کرتا نظر آتا ہے۔ وہ تقلید پر تکیہ نہیں کرتا تھا بلکہ اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں بلوچ و بلوچستان کے مسائل کا حل ڈھونڈتا تھا۔ وہ اپنے ایک رفیق، میر تاج محمد ڈومبکی کو لکھتا ہے؛

''خدائے قدوس کے نزدیک انفرادی زندگی کی صلاحیت جماعتی منفعت کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ قرآن کریم میں جہاں کہیں ہمیں طریق استدعا بتایا گیا ہے وہ جماعت کی طرف سے ہے۔ سورۃ فاتحہ کو ہی دیکھیے۔ اھدنا الصراط المستقیم ہے اھدنی الصراط المستقیم

نہیں۔انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم یہ سب جمع کے صیغہ جات ہیں۔''

ایک دوسرے خط (21 مئی 1932) میں ان مقاصد کے حصول کے لیے عملی اقدامات کرنے کا ذکر بھی ملتا ہے؛

''قریبی عرصہ سے میرا ارادہ ہے سندھ، بالخصوص جیکب آباد (جو مرکز ہے بلوچوں کا) آنے کا، اور بلوچ بھائیوں کی امداد سے فی الحال ایک انجمن ''حزب اللہ'' یعنی خدائی فوج کی بنیاد ڈالنے کا۔جس کے اغراض ومقاصد واضح ہیں۔یعنی دینِ الٰہی وقیام بر دینِ الٰہی کی تبلیغ''۔

مگسی صاحب کٹھ ملائیت کا سخت مخالف تھا۔وہ اسلام میں پروگریسو باتوں کو اپنے منشور کا حصہ بناتا تھا۔چنانچہ وہ اپنے ایک خط میں ''ملایانِ دین'' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ایک اور خط میں لکھتا ہے؛

''اپنی کافریت کی تردید لاحاصل، فضول۔اپنی بے ریشی اور اسی وجہ سے صفِ اسلام سے اخراج کے الزام پر بھی سرافگندگی۔اچھا بھائی یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ پیارے حسین کی برسی منانی ہے۔میں اِدھر منا رہا ہوں، تو اُدھر منانا۔مگر خدارا شغلِ گریہ کو نصب العین نہ بنانا۔ بلکہ ایک جشن مناؤ کہ یہی دن ہے ہر اسلامی زندگی کا:

من شیرِ نوجوانم و میدانم آرزوست
در دشتِ کربلا یکے جولانم آرزوست

اور ایسا ہو کہ؛

یوں اُٹھا برسی ہوئی آنکھیں کہ دریا کانپ اُٹھے

چنانچہ آپ مگسی صاحب کے شعوری ارتقا کا پیچھا کریں تو معلوم ہوگا کہ شروع میں وہ مندرجہ بالا پیراگراف کے بطور پان اِسلام ازم کا شیدائی تھا۔اُس زمانے کے برصغیر میں اِس سوچ کے بے شمار دانش ور پائے جاتے تھے۔فرق صرف یہ ہے کہ ان میں سے بہت کم لوگ عمل میں آگے بڑھے۔

2۔ نیشنلزم

یوسف مگسی اپنے متبادل نظریہ کو ہر وقت پانی دیتا رہا۔چنانچہ اس نے آگے چل کر اپنے اس نظریہ میں اِس سے مطابقت رکھنے والے نیشنلزم کا اضافہ کرتا ہے۔امین کھوسہ کو خط لکھتے ہوئے کہتا ہے؛

''.....اول اسلام، بیچ میں اسلام، آخر میں اسلام۔اس کے بعد بلوچیت''۔

وہ بلوچ نیشنلزم کو اسلام سے اس طرح ملاتا ہے کہ دونوں انسان کے ساتھ اپنی گہری کمٹ منٹ رکھنے سے ایک بڑی قوت بن جاتے ہیں:

بلوچم و شجاعتِ بلوچم آرزوست
خیزید! باز نعرہ اسلامم آرزوست

8 اپریل 1932 کو اپنے روحانی انیس، امین کھوسہ کو خط میں لکھتا ہے؛

''تقریباً تین چار ماہ سے مجھے اس امر سے روحانی اذیت محسوس ہو رہی تھی کہ کیوں میرے بکسوں پر میرے نام کے آگے ''نواب زادہ'' کا ناجائز بدنما دھبہ لگا ہوا ہے، اگر میں خود نواب نہیں تو اپنے باپ کی نوابی سے کیوں اپنے آپ کو مشہور کروں۔الغرض آج صبح اٹھتے ہی کسی بورڈ نویس کو دکان سے گھسیٹ کر لایا اور اسے کہا کہ جلدی اس ''نواب زادہ'' کے منحوس دھبے سے مجھے دھو ڈالو۔تین بکس تھے، سب کو صاف کروا کر صرف اپنا اصل نام لکھوا دیا اور مگسی کا لفظ بھی کھدوا ڈالا۔ صرف بلوچ لکھوایا۔مجھے تو سچ اگر پوچھیں تو مسلمان اور بلوچ بس یہ لفظ ہی پیارے لگتے ہیں۔اس سے بھی بڑھ کر ''انسان''۔(1)

بلوچ کے علاوہ، اسے اپنے وطن بلوچستان سے بھی بہت محبت تھی۔ایک دوست کے نام اس کا یہ خط دیکھیے:

''بھائی نسیم کو پیار۔الغرض وطن بلوچستان کے ذرہ ذرہ کو پیار۔اور آنسوؤں کا تحفہ۔ مادرِ وطن کی گرم تپتی دھوپ اور اُڑتی ہوئی خاک کو پیار۔مادرِ وطن کی گلیوں میں پھرنے والے گدھوں

اور کتوں کو پیار۔ مادرِ وطن کے اندر بنے ہوئے زندانوں میں وطن کے رہنے والے شیداؤں کو پیار۔ زندان کے منصبِ اول سے لے کر آخر تک کو پیار۔ ان کی خوش نصیب آنکھوں کو بوسہ جو مقدس ہستیوں کو ہر وقت دیکھا کرتی ہیں۔

اودیس میں رہنے والے بتا، کس رنگ میں ہیں یارانِ وطن!''

3۔ سامراج دشمنی

نیشنلزم پر اگر یسو ہو یا نہ ہو، اُس میں سامراج دشمنی ضرور گندھی ہوتی ہے۔ اِس لیے کہ کسی جارح قوم کی زیادتیوں کے خلاف ہی آپ نیشنلسٹ بنتے ہیں۔ چنانچہ یوسف مگسی اور اس کے رفقا زبردست سامراج دشمن (برطانیہ دشمن) لوگ تھے۔ وہ چوں کہ زیرِ زمین سیاست نہیں کرتے تھے اس لیے ٹکٹکس کے بطور دامن بچاتے ہوئے، بہت ہی مدھم اور مبہم سامراج دشمن سیاست کرتے۔

وہ اِس لیے بھی ایسا کرتے تھے کہ انہوں نے عوام کو شعوری سطح پر ساتھ لینا تھا۔

بلوچ بالائی طبقات تو انگریز کے ساتھی تھے۔ اُن سے بھی اپنی تحریک کو بچانا لازم تھا۔ اس لیے کہ وہ تو گھر کا بھیدی تھے:

''سات سمندر پار کا ایک بوزنہ نما انسان زمامِ کلات کے گھوڑے کو تھامے سرپٹ محوِ جولانی ہے اور ہم پاپیادہ بے زادِ راہ ہیں۔ آپ ایک بلوچ خان کہتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ خدا ہماری موجودہ حکومت کو سلامت رکھے، آپ کو سال دو کے اندر ہزاروں بلوچ خان ملیں گے۔ روتے، چیختے، چلاّتے اور انگریزی حکومت کے گن گاتے۔۔۔''۔

میر یوسف علی خاں کی سامراج دشمن جدوجہد کی ابتدا بلاشبہ ''فریادِ بلوچستان'' نامی مقالے سے ہوتی ہے۔ اور پھر یہ مختلف روپ اختیار کرتی جاتی ہے۔ اس نے انگریز سامراج کی ریشہ دوانیوں کے خلاف اُس وقت شعوری آواز بلند کی، جب بلوچستان میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا

تھا۔ لہٰذا یہ خیال کر لینا درست نہیں کہ اُس کی جدوجہد محض ایک بے حقیقت شمسِ تاریک کے خلاف تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ اُس کی رزم آرائیاں برٹش امپیریلزم کے خلاف تھیں۔ اور اس کے زورِ ذہن و بازو کا ہدف تاجِ برطانیہ تھا۔ انگریز کے مقامی کھڑپچے تو زد میں آنے ہی تھے۔

میر یوسف علی خان اُن عظیم الشان قومی تحریکوں سے خود کو مکمل طور پر وابستہ کر چکا تھا جو آزادیٔ ہند کے لیے جدوجہد کر رہی تھیں، قربانیاں دے رہی تھیں اور بیرونی سامراج کے نجس وجود کو اپنی سرزمین سے اٹھا لینے پر اصرار کر رہی تھیں۔ ''زمیندار'' اخبار کا بلوچستان نمبر دیکھئے اور جیکب آباد اور حیدرآباد میں منعقدہ کانفرنسوں پر نظر کیجیے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ میر یوسف علی خان ایک زبردست سامراج دشمن راہنما بن کر ابھرا تھا اور وطن کی آزادی اُس کی منزل تھی۔

برطانوی سامراج اُس کے عزائم سے خوف زدہ تھا۔ اسی لیے اُس کو چین سے کام کرنے نہیں دیا جاتا تھا۔ 1934 میں اس کے رفقا گرفتار کر لیے گئے۔ اور پھر اے جی جی بلوچستان اور برطانوی نژاد وزیراعظم نے اسے مجبور کرنا شروع کر دیا کہ وہ بلوچستان چھوڑ کر لندن روانہ ہو جائے۔ یہ حکم جبری تھا۔ اسی دوران انگریز انتظامیہ مگسی کی مالی امداد سے چلنے والے متعدد اخبارات یعنی 'البلوچ' کراچی، اور 'بلوچستان جدید' کراچی کو یکے بعد دیگرے ضبط کرتی رہی تا کہ انجمن اتحادِ بلوچاں اور یوسف عزیز کے افکار و عمل کے پرچار کو روکا جا سکے۔

سامراج دشمنی میں ایک اور چیز بھی شامل رہتی ہے: اپنی قوم سے محبت۔ جب تک اپنی قوم سے محبت نہ ہو تو بیرونی قبضہ گر کی مخالفت نہیں ہو سکتی۔ 16 اکتوبر 1932 کو البلوچ کراچی میں یوسف عزیز کا ایک مضمون شائع ہوا تھا: ''اپنے عوام سے محبت۔'' یہ مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

'مجھے یہاں ملتان آئے ہوئے تقریباً دو ہفتے ہونے لگے ہیں۔ اس اثنا میں اپنے علاج میں مصروف رہنے کے باوجود قبیلہ مگسی کے ان نمائندگان کی شکایت سننے کے لیے بھی وقت لگا تا رہا جو میرا ملتان میں آنا سن کر اپنی تکالیف سنانے مجھ تک پہنچے۔ واقعی ان کی تکالیف اور مصائب کا استماع مجھے تکلیف پہنچائے بغیر نہ رہ سکا۔ اگرچہ ایسی حالتوں میں میں صرف جذبات کے تابع نہیں

رہا کرتا مگران کے مصائب کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ جس وقت میں بستر پر لیٹے ان کا دردناک قصہ سنتا رہا، بار بار دل میں یہ خیال آتا تھا کہ چارپائی پر اپنے آپ کو اٹھوا کر اس جدوجہد میں شریک ہو جاؤں جس سے ان کے مصائب کے رفع ہونے کا امکان ہوسکتا ہے۔ اس اثنا میں مجھے متعدد بلوچی احباب سے ہمدردی اور مگسی مصائب میں اپنی خدمات پیش کرنے کے حوصلہ افزا پیامات موصول ہوئے۔ جو میری روحانی تقویت کا باعث ہوتے رہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ انسانی جسم جب بیماری یا کمی غذا کے باعث کمزور ہوتا ہے تو روحانیت غلبہ کرتی ہے اور اس حالت میں جو فیصلہ کیا جاتا ہے اس میں صرف روحانیت ہی کو دخل ہوتا ہے اور وہ بہترین فیصلہ ہوتا ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ میری بیماری اور جسمانی کمزوری اس فیصلہ میں میری معاون ثابت ہوئیں۔

''میں اپنے فیصلے کے عملی حصہ کو فی الحال بیان کرنا نہیں چاہتا۔ یہاں مجھے اپنے ان بلوچی احباب کا جو اپنے حسنِ خیال کے باعث میرے ہر فعل کو اچھا سمجھ کر میری شرکت پر آمادہ ہوجاتے ہیں، خاص قلبی شکریہ ادا کرنے کے بعد ان کو دعوتِ انتظار دینا ہے۔ ہمیں قبل کسی عملی اقدام کے، کرنل کیٹر ایجنٹ گورنر جنرل بلوچستان کی آمد کا انتظار کرنا ہے جو اپنی رخصت ختم کرنے کے بعد اکتوبر کے اول عشرہ میں چارج لینے والے ہیں اور جن کے۔۔۔ انصاف نے مگسی مصائب کے گزشتہ تاریخی دور میں ثابت کر دیا ہے کہ وہ حقیقتاً ایک بیدار مغز اور منصف حکمران ہیں۔ میرا خیال ہے کہ صاحب موصوف اور جناب ہز ہائی نیس خان قلات اور موجودہ پولیٹکل ایجنٹ مسٹر سکرین ایک بیدار دماغ انگریز ہیں، متفقہ طور پر کوئی بہتر اور پائیدار حل نکالنے کی کوشش کریں گے۔

''میں مگسی قوم کے نمائندگان کی خدمت میں یہی گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ وہ فی الحال باوجود ہر قسم کے اشتعال کے صبر کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں، اور نہ مصائب میں اضافہ کے باوجود کسی ایسے فعل کے مرتکب ہوں جس میں امنِ عامہ میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہوسکے۔۔۔ ہم انشاءاللہ اپنی عالمگیر محبت کے ذریعے سے اپنے مصائب کا خاتمہ کریں گے۔ میں عنقریب اس سلسلہ میں افسرانِ مجاز سے خط و کتابت کرنے والا ہوں۔۔۔۔''

پوری اِنسانیت اور بلوچ قوم کے لیے درد رکھنے اور سیاست کرنے والا یوسف عزیز مگسی

اپنے علاقے کے لوگوں سے کبھی کبھی غافل نہیں رہا۔ اپنے لوگوں کی حالت پر اس دردمند حساس طبیعت انسان کو ترس آتا تھا۔ وہ اپنے علاقے جَھل کی تعمیر و ترقی اور لوگوں کی خوش حالی کا خواہاں تھا۔ اپنا علاقہ اور اپنے لوگ اُسے کس قدر عزیز تھے، اس کا اظہار ستمبر 1933 کو امین کھوسہ کو لکھے ہوے ایک خط میں کرتا ہے؛

''میں بیرونی سیاست سے علیحدہ ہونے کی سوچ رہا ہوں۔ اور یہی خیال ہے کہ صرف تعمیری کام پر اپنی ناچیز قوتیں صرف کردوں۔ میں جانتا ہوں کہ عام سیاسیات سے میری علیحدگی احباب پر نہ صرف شاک گزرے گی بلکہ میرے متعلق قسم قسم کی چہ میگوئیاں وردِ زبان ہوں گی۔ مگر میں ایمانداری سے محسوس کرتا ہوں کہ یہاں کا افلاس اور جہل مجھ سے کیا مطالبہ کر رہی ہے۔ اور آیا ان کا حق مجھ پر دیگر حقوق کی نسبت کس قدر افضل ہے''۔

4۔ فیوڈل ازم کا مخالف

سیدھے سادے نیشنلزم کی تحریک میں جاگیردار یا سردار دشمنی نہیں ہوتی۔ بلکہ کبھی کبھی تو یہی لوگ اُس کی قیادت کرتے ہیں۔ صرف نظریاتی لوگ ہی فیوڈلزم کے خاتمے کے لیے کام کرتے ہیں۔ یوسف انہی اچھے لوگوں میں سے ایک تھا۔

مثال کے طور پر ہم اس واقعہ کا پہلے بھی کر آئے ہیں کہ بلوچ کانفرنس (1932) منعقدہ جیکب آباد کے لیے نواب محراب خان تمندار بگٹی نے گراں قدر چندہ یوسف عزیز خان کو دیا تھا۔ لیکن جب بگٹی قبیلہ کے ایک وفد نے نواب کے مظالم کے خلاف یوسف علی خان کو اپنی فریاد پہنچائی تو یوسف علی خان نے سردارانہ تعلقات کی پرواہ کیے بغیر مظلوم بگٹی قبائلیوں کی عملی حمایت کا اعلان کیا۔ نواب محراب خان بگٹی کو اُس کا عطا کردہ عطیہ بھی واپس کر دیا اور کہا کہ ''بگٹی کی طرف سے یہ چندہ درحقیقت رشوت ہے تاکہ میں اور تنظیم، مظلوم بگٹیوں کی مدد نہ کر پائیں''۔

نیشنلسٹ یوسف سرداریت سے نفرت کرنے لگا۔ پہلے پہل تو وہ خود بدلا۔

شانِ سرداری زطرزِ اوشکست

میر یوسف علی خان اِس حد تک تبدیل ہوا کہ اس نے دو جون 1934 کو ایک خط میں دوست کو لکھا:

''.....آپ مجھے سردار نہ لکھا کریں۔ خدا نے اس نحوست سے نجات دلا دی ہے''۔(2)

اسی طرح وہ امین کھوسو کو یہ دلچسپ بات لکھتا ہے:

''یہاں دن میں دو تین بار حق و باطل کی جنگ چھڑ جاتی ہے اور یقین جانیے کہ آپ کے اس ناچیز بھائی نے اعلانِ حق میں کوتاہی نہیں کی۔ مخالفت زوروں پر ہے۔ خاص کر وڈیرہ بنگلزئی تو خوب مخالف ہو گئے ہیں۔ صرف سرداری مناظرے نہیں ہوئے، بلکہ باقاعدہ جنگ اور مباحثے کی صورت میں اپنے اپنے خیالات کا اعلان کیا جاتا ہے۔ مگر شکر ہے کہ مخالفین باطل کے اظہار کے بعد نادم ہو جاتے ہیں۔ یہاں کبھی کبھی ہاتھا پائی اور لڑنے تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں جسماً کمزور ہوں۔ اگر مارا گیا تو بس ایک یاد کا اُمیدوار ہوں''۔(3)

امین ہی کو ایک اور خط میں لکھتا ہے:

''ایک غریب الوطن شخص ہزاروں کے مقابلے میں تن تنہا ڈٹا ہوا ہے اور اللہ پر ایک اندھا یقین رکھے ہوئے ہے''۔

یوسف علی خان جہاں جدید اسلامی تعلیم کا حامی اور بلوچستان کی آزادی کا دلدادہ تھا وہاں وہ اس امر سے بھی واقف تھا کہ ایک منصفانہ سماجی ڈھانچہ سرداریت کے خاتمے کے بغیر ناممکن ہے۔ وہ ریاستِ کلات میں سرداروں کے اختیارات کم کرنے اور جمہوری قدروں کے فروغ کے لیے کوشاں رہتا تھا۔

یوسف عزیز دل برداشتہ ہونے کی بجائے ایک مجاہدانہ عزم کے ساتھ نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کا عزم جری کرتا نظر آتا تھا۔ وہ ہمہ وقت سرداریت کے خلاف ایک لامتناہی جنگ لڑنے کا مصمم ارادہ کرتا نظر آتا ہے۔ اپنے عزیز دوست میر محمد امین کھوسہ (جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا طالب علم تھا) کو لکھتا کہ اُن کی آئندہ حکمت عملی سرداری نظام اور سرداروں کے خلاف ہوگی۔ وہ سرداریت کے خلاف میر احمد یار خان (حکمرانِ کلات) کی آئینی اصلاحات کا ساتھ دے گا۔

یہ کہنا بہت مناسب ہوگا کہ سردار / مخالفت اُس کے نظریے کے اولین ستونوں میں سے ایک بن گئی۔ اور یہ اس نے محض کتابوں اور تقریروں سے اخذ نہ کیا بلکہ وہ خود ایک سردار کی حیثیت سے یہ سب دیکھتا رہا، مشاہدہ کرتا رہا اور سیکھتا رہا۔ نیز وہ ایک سردار کے بطور ریاست کلات میں ایک معتبر کردار تھا۔ اس نے اس نظام اور اس کے مالکوں کی سڑاند خود دیکھی اور بھگتی۔

یہ موضوع بہت پہلو رکھتا ہے۔ یوسف عزیز نے اس سے نمٹنے کے کئی طریقے ایجاد اور دریافت کر لیے۔ مثال کے طور پر اس نے انگریز اور کلات کی بلوچ حکومتوں سے یہ مطالبہ سرِفہرست رکھا کہ بلوچستان کو بھی وہ اصلاحات دی جائیں جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں میسر ہیں۔ علاوہ ازیں اس نے زور دیا کہ بلوچ رواج اور رسم کی کوئی چیز بھی تحریر میں نہیں ہے۔ سب کچھ زبانی ہے اور مناقشوں جھگڑوں کا فیصلہ سردار کرتا ہے۔ وہ گویا چیف جسٹس ہے۔ اس لیے وہ کہتا تھا کہ بلوچ رسم و رواج کو تحریر میں لایا جائے، اور اُن میں سے منفی اور غیر انسانی شقیں ہٹا دی جائیں۔

اسی طرح وہ شخص اپنی ساری شعوری زندگی ''جرگہ سسٹم'' کے خلاف بولتا لکھتا رہا۔

بعد میں تو یوسف عزیز نے بلوچ قوم اور بلوچستانی مظلوم طبقات کے حقوق کے تحفظ و بازیابی کے لیے اپنے طبقہ (سردار و سردار خیل) سے عملاً علیحدگی اختیار کر لی تھی۔

کھوسہ کو ایک خط میں لکھا:

''اس وقت ہم ہندوؤں کو طعنہ دے رہے ہیں کہ ان میں چھوت پنی ہے۔ ذرا غور کرو کہ کیا ہمارے بلوچوں میں چھوت پنی نہیں؟۔ ایک بلوچ، اپنے سردار کے مقابلے میں چارپائی پر بیٹھ سکتا ہے؟ کھانا کھا سکتا ہے؟''

مکسی ہی کے ایما پر رئیسانی، رند، اور بگٹی قبائل میں سرداریت کے خلاف پُرامن تحریکوں اور ہجرت کا آغاز کیا گیا تھا۔ اس محاذ کو مزید طاقتور بنانے کے لیے نواب زادہ یوسف علی خان نے علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد ظفر علی خان ایڈیٹر 'زمیندار' لاہور سے ملاقاتیں کیں اور اُن کی امداد کا طالب ہوا تھا۔ اس کے عملہ کو خوف و ہراس، مالی پریشانیوں اور سزا و عقوبت سے بھی گزرنا پڑا لیکن

یوسف عزیز اور اُس کے رفقا سیسہ پلائی دیوار ثابت ہوئے۔

اُس نے اپنی ایک طویل فارسی نظم میں اپنا نظریہ پیش کیا۔ یہ نظم دراصل سرداروں کے اُس وفد کی طرف سے یوسف کے خلاف انگریز اور خان کو شکایات کا احاطہ کرتی ہے۔ نظم کا عنوان ہے ''نوحہِ سردارانِ سراوان''۔ اس نظم کا مفہوم یہ ہے:

''اس (یوسف) نے مزدوروں سے دل گانٹھ لیا، سرداروں سے ساتھ چھڑا لیا، سرداری شان چھوڑ دی، وہ رسومِ کہن کو لات مارتا ہے، اس نے سرداروں کی اطاعت کو ختم کروادیا، وہ اپنے غلام کے ساتھ کھانا کھاتا ہے۔ اس کی دوستیاں برہنہ پا لوگوں کے ساتھ ہیں۔ وہ خان اور سرداروں کے دشمن کلاسز کے ساتھ گھومتا ہے، بندہ و آقا کو ایک جیسا سمجھتا ہے۔ وہ عام آدمی اور سردار کا خون بہا مساوی قرار دیتا ہے۔ وہ نوجوانوں کو گمراہ کرتا ہے۔ وہ کافر ہے، اس کی باتیں کافرانہ ہیں، یہ مساوات یہ اخوت جہالت ہے۔ وہ ہمارا دشمن ہے تو آپ سے بھی نہیں بنے گا۔ اس کے خطرناک طرز سے ڈرو، وہ روس سے لینن کو یہاں لایا ہے اور اس نے مساواتی گروہ تشکیل دے دیا ہے۔ آپ بروس اور ڈیو کو یاد دلائیں کہ ہم نے عالمی جنگ میں ان کی کتنی خدمت کی۔ ہم نے سیم وزر خرچ کیا، کعبہ کریم پر حملے کردیے، ترک و بغداد و عرب کو ہم نے مارا۔ ہم نے سب سے ناطے توڑے اور صرف تم سے جوڑے۔ اے شہنشاہِ عظیم! اب ہماری مدد کو آ۔ اور یوسف اور اس کے ساتھیوں کو قید کردے''۔

سرداری نظام سے یوسف عزیز مگسی کی سخت نفرت آپ اُس 14 اگست 1933 کے خط میں دیکھ سکتے ہیں جو اس نے محمد امین کھوسہ کو لکھا تھا: ''اب سرداروں کو کچلنا چاہیے ان سے سدھرنے کی اُمید فضول ہے''۔

اس کے بعد دو سال کے اندر اندر وہ کچھ اور بھی ہوگیا۔ گو کہ جلاوطن کر کے انگریز نے اُس سے جان چھڑائی تھی۔ مگر اِسی لندن نے اس پر جادو کردیا۔ اُس نے وہاں بورژوا جمہوریت دیکھی۔ انسانی سہولتیں دیکھیں۔ اور وہ فیوڈلزم اور سرداریت کا راسخ مخالف بن گیا۔ وہاں جلاوطنی کے زمانے میں اس نے عنقا کو خط میں لکھا تھا کہ: ''صمد اور کرد کے جیل جانے کے بعد میرے لیے

سرداری لعنت تھی جس سے قدرت نے آزاد کرلیا۔'' (4)

اُس نے کھوسہ کی ایک غلط فہمی کے بارے میں کہا:

''آپ کے خطوط کے لب ولہجہ سے باآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ نے مجھے محوِ سرداری سمجھ رکھا ہے اور سمجھ چکے ہیں کہ سرداری پر آکر میں نے اپنا جوہرِ انسانیت بھی کھودیا ہے۔ وقت بہترین جج ہے''۔

***

فیوڈلزم مخالف ہونے کا مطلب اس کے سارے ویلیو سسٹم کی مخالفت ہوتی ہے۔ اور فیوڈلزم کے ویلیو سسٹم میں عورت کو پست اور پسماندہ رکھنا مرکزی نکتہ ہوتا ہے۔

بلوچوں میں بے شمار مدبر پیدا ہوئے ہیں۔ بہت روشن فکر، دوراندیش اور وژنری راہنما۔ مگر، اِن سب کا سرخیل بلاشبہ یوسف عزیز مگسی تھا۔ اُسے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ بلوچستان کے اندر موجود آدھی آبادی یعنی عورتوں کو انسانوں والے حقوق حاصل نہیں ہیں اور یہ 50 فیصد آبادی اپاہج و ناکارہ رکھی گئی ہے۔ وہ حیران تھا کہ ایک ایسی سرزمین کی ترقی کیسے ممکن ہوگی جہاں آبادی کا اتنا بڑا حصہ بے کار و بے فائدہ پڑا ہوا ہو۔

اُس نے دیکھا کہ بلوچ و بلوچستانی خاتون نہ صرف یہ کہ ناکارہ کردی گئی ہے بلکہ اُس کو تو انسانوں میں ہی شمار نہیں کیا جاتا۔ وہ ڈبل ظلم (طبقاتی نظام اور پدرسری) کی شکار ہے۔ اُس کے حال سے تو اُس کا ماضی اچھا تھا جہاں ایک ابتدائی اور فرسودہ سا کمیونزم رائج تھا۔ مادرسری کے اُس نظام میں عورت کام کرتی تھی۔ سماج اُسے عزت دیتا تھا۔ وہ انسانوں میں شمار تھی۔ فیصلوں اجتماعوں اور جنگوں میں حصہ لیتی تھی، بطور سپاہی بھی اور بطور کمانڈر بھی۔ اسی طرح وہ جنگیں رکواسکتی تھی۔ خوراک و آمدن کی تقسیم کار تھی۔

بلوچی کلاسیکی شاعری بھری پڑی ہے ایسے تذکروں سے۔

عورتوں کے حقوق کے بارے میں یوسف عزیز مگسی کی بے چینی اولین بار ہمیں بلوچ کانفرنس جیکب آباد میں نظر آتی ہے۔ یہ چار روزہ کانفرنس دسمبر 1932 کو منعقد ہوئی تھی۔ بلوچ

تاریخ کی اس اولین آل انڈیا سطح کی بلوچ کانفرنس میں عورتوں کی شرکت کی حوصلہ افزائی سے متعلق جنرل سیکریٹری آل انڈیا بلوچ کانفرنس جیکب آباد سندھ کا مندرجہ ذیل ٹکڑا پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے:

''۔۔۔ورکنگ کمیٹی نے اپنی محترم ہمشیرگانِ وطن کی درخواست کا خیر مقدم کرتے ہوئے نہایت خوشی سے اُن کی استدعا کو منظور کرلیا کہ مستورات کے لیے باقاعدہ پردہ کا انتظام کیا جائے اور بغیر فیس داخلہ کے شامل کیا جاوے۔ ہم اپنی محترم خواتین کی خدمت میں التجا کرتے ہیں کہ وہ اپنی بہنوں کو جو عموماً تعلیم سے بے بہرہ اور مردوں سے کئی گنا زیادہ جہالت میں ہیں، بیدار کریں اور اپنی جیکب آباد کی بہنوں کی تقلید کرتے ہوئے کانفرنس میں شمولیت فرماویں۔ اور دیگر بہنوں کو بھی اغراض ومقاصد سے واقف کرتے ہوئے مستقبل کے روشن پہلو سے آگاہ کریں''۔

صرف بلوچ نہیں بلکہ اس پورے خطے کے لوگوں کے لیے ''آل انڈیا بلوچ کانفرنس'' ایک نعمت تھی۔ یہ ہمارے قومی افتخارات میں شاید سب سے بڑا افتخار ہے۔ یہ ایک مہذب وشائستہ انسانی تحریک کا آغاز تھی۔ اس میں وقتی معاملات کے ساتھ ساتھ عالمگیر ابدی سچائیوں کو ہمارے لیے جمع کردیا گیا تھا۔ مثلاً ہمیشہ سے یہ ایک اہم سوال رہا ہے کہ ''بلوچ عوامی تحریک میں عورت کا سٹیٹس کیا ہو؟''۔

ہماری پوری نسل اس بحث میں کھپتی رہی۔ تقریباً ایک صدی گزر گئی یہ بحثیں کرتے کرتے۔ کاش ہماری قوم کو 1932 کی بلوچ کانفرنس کی روداد پہلے مل جاتی تو اس پوری بحث میں جانے کی ضرورت نہ پڑتی۔ ہمارے باصلاحیت اکابرین اُس زمانے میں ہمارے لیے ہمیشہ کے لیے یہ معاملہ طے کر گئے تھے۔

''البلوچ کے'' 4 دسمبر 1932 کے شمارے میں ایک خاتون مسز غلام حیدر مغل کی طرف سے دوسری خواتین کے لیے یہ اپیل شائع ہوئی ہے: ''میری محترم ہمشیرو! آپ آل انڈیا بلوچ کانفرنس جیکب آباد کے انعقاد کی نسبت مختلف اخبارات میں اعلانات ملاحظہ فرما چکی ہو۔ اس وقت جبکہ ہم اس اصول تعاون کو جس پر کاربند رہنے کے لیے ہمارے پاک مذہب کے بانی

بابرکت قبلہ دوجہاں رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے، چھوڑ چکی ہیں۔ اور تغافل میں رہ کر دائرہ تہذیبِ نسواں سے گر کر تنزل میں پڑ گئی ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اپنی ہمسایہ قوموں کی ترقی پر غور کریں اور اپنی بہبودی کی جدوجہد کرتے ہوئے دائرۂ تہذیب میں رہ کر اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دیویں۔ اس وقت جبکہ دنیا سے تاریکی کا پردہ اٹھ چکا ہے اور ہر جا روشنی کا علم ہے اور تمام قومیں اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے میدانِ ترقی میں نہایت سرعت سے گامزن ہیں۔ ہمارے محترم برادران زعمائے بلوچستان نے اپنی قوم کا درد محسوس کرتے ہوئے مردہ قوم کی فلاح وبہبودی اور راہِ مستقیم سوچنے کے لیے ''آل انڈیا بلوچ کانفرنس'' کا اعلان فرمایا ہے۔ اور ہماری استدعا پر محترم ہمشیرگانِ وطن کو بھی مدعو کیا ہے اور بغیر فیس داخلہ کے شمولیت منظور فرمائی ہے۔ نیز پردہ کا خاطر خواہ انتظام کیا ہے۔ ان کی اس فراخدلی کے لیے ہم ممنون ہیں۔ اس لیے میں اپنی ہمشیرگانِ وطن مسلم وغیر مسلم کو اپنی ان پستیوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اپیل کرتی ہوں کہ خدارا بیدار ہوجاؤ اور وقت کی قدر کرو۔ اس موقع کو غنیمت جان کر آل انڈیا بلوچ کانفرنس میں شمولیت فرما کر اپنی پستیوں کا علاج سوچ نکالو اور ہمسایہ قوم کی خواتین کی طرح اپنے بھائیوں کے دوش بہ دوش ہو کر ان کی حوصلہ افزائی کرو۔''

27 دسمبر کو یہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ ہمیں اس میں کی جانے والی تقریریں تو نہ مل سکیں مگر اس میں منظور کردہ قراردادیں ملیں۔ قراردادیں کسی بھی جلسے اجلاس، سیمینار وغیرہ کا نچوڑ ہوتی ہیں۔ اقوام متحدہ سے لے کر کسی مقامی اجلاس تک یہی روایت ہے کہ قراردادوں کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ چنانچہ خوش قسمتی ہے کہ ہماری قوم قراردادوں جیسی بڑی دولت کی مالک ہے۔ وہ بھی کسی عام اجلاس کی نہیں بلکہ ''آل انڈیا بلوچ کانفرنس'' کی قراردادوں کی۔ مجھے یقین ہے کہ بلوچ کے قومی اعزازات میں 1932 کی آل انڈیا کانفرنس کی قراردادیں مہرگڑھ، پرنسیس آف ہوپ، عظیم الشان بلوچ ساحل، معدنی دولت، اور آزادی کی جنگوں جتنی اہم ہیں۔ اس چار روزہ کانفرنس کے اختتام پر جو 28 قراردادیں منظور ہوئی تھیں وہ سب کے سب مرد وزن دونوں کے لیے تھیں۔ البتہ اُن میں سے چھ تو الگ اور مخصوص طور پر عورتوں کے بارے میں تھیں۔ ملاحظہ ہوں:

1۔ یہ کانفرنس سیاہ کاری کے اس رواج کو بنظرِ نفرت دیکھتی ہے جس کے ذریعہ سے سیہ کار آدمی اور قاتل سے ان کی لڑکی یا بہن جبراً نکاح میں لی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ کانفرنس گورنمنٹ بلوچستان اور ریاستی کانفیڈریشن آف بلوچستان سے انسانیت کے مقدس نام پر اپیل کرتی ہے کہ آئندہ کسی معصوم لڑکی کو کسی فاحش آدمی کے جرائم کا شکار نہ بنایا جائے۔

2۔ یہ کانفرنس گورنمنٹ سے استدعا کرتی ہے کہ بلوچستان میں قحبہ خانہ (چکلا) کو جو شرعاً اور اخلاقاً ایک سنگین اور مجرمانہ رواج ہے، بند کیا جائے۔

3۔ یہ کانفرنس رسمِ لب اور ولور کو نہایت ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اپنے بلوچ، افغان وغیرہ اقوام بلوچستان سے امید کرتی ہے کہ اس حقیر و ذلیل رسم کو جتنی جلد ہو سکے منسوخ کر دیں اور گورنمنٹ سے امید رکھتی ہے کہ وہ اس مذموم رسم کے انسداد کی تدابیر جلد از جلد عمل میں لائے گی۔

4۔ یہ کانفرنس گورنمنٹ برٹش بلوچستان اور ریاستی کنفیڈریشن آف بلوچستان سے التجا کرتی ہے کہ وہ مہربانی کر کے تعلیمِ نسواں کو اپنے اپنے علاقوں میں ترقی دیں اور ساتھ ہی قوم سے درخواست کرتی ہے کہ وہ اس طرف خاص توجہ مبذول فرمائے۔

5۔ یہ کانفرنس حکومت ہائے بلوچستان سے استدعا کرتی ہے کہ وہ عورتوں اور بیواؤں کو بطورِ ورثہ اشیائے خانگی کی طرح ایک شخص کی موت کے بعد اُس کے وارثوں کے حوالے کیے جانے کو قانوناً ممنوع قرار دے اور عورتوں کے حقوق زناشوئی، وراثت اور ترکہ بروئے شرعِ انور قائم کیے جائیں۔

6۔ یہ کانفرنس ریاستہائے بلوچستان، سندھ اور پنجاب سے درخواست کرتی ہے کہ بلوچوں کی اِس مذموم مراسم کو بند کرا دے جس کی رو سے لڑکیوں کی نسبت اُن کی پیدائش سے قبل قرار پائی ہے۔

ٹھنڈے دل سے ذرا دوبارہ اِن قراردادوں کو دیکھیے۔ اور پھر آپ بلوچوں کے آج کے کسی جلسے سیمنار وغیرہ کی قراردادیں بھی دیکھیے۔ آپ حیران ہوں گے کہ وہ لوگ ہم سے زیادہ روشن فکر اور جرأت مند تھے۔ انھیں ''معروضی مجبوریوں'' کا کوئی بہانہ درپیش نہ تھا۔ وہ اپنے قومی فریضے کی

ادائیگی میں کسی طرح کا پس وپیش نہیں کرتے تھے۔

1932 کانفرنس کے بعد بھی یوسف عزیز مگسی اور اُس کے ساتھی اپنے شعور کو ارتقا دلاتے رہے۔ یہ لوگ حتمی طور پر عورتوں کے انسانی جمہوری حقوق کے داعی تھے۔ لندن جلاوطنی کے دوران 1935 میں یوسف عزیز مگسی نے اپنے سیاسی رفیق محمد امین کھوسہ کو ایک خط میں یوں لکھا:

''مگر امین! یورپ کے متعلق آپ کے علمائے دین کی تمام رائیں غلط، بخدا کہ غلط۔ یورپ بہت آزاد ہے۔ آپ سے بازار میں ریسٹورینٹوں میں، پارٹیوں میں آزادانہ عورتیں ملیں گی، باتیں کریں گی، کھیلیں گی، سنائیں گی اور رشتہ دار کوئی بھی دخل نہیں دیں گے۔ مگر اخلاقی لحاظ سے وہ برائی جو آپ کے درازریش حضرات اُس سے منسوب کرتے ہیں، ایک فیصدی پائی جائے گی۔ یہاں کی عورت اپنی عصمت کی حفاظت آپ کے رسم ورواج کے مطابق پردہ، اور تلوار بندوق کے ڈر کے ذریعہ نہیں کرتی۔ اُن کا معیار کچھ اور ہے۔ کاش کہ اس خط میں تفصیلات لکھ سکتا۔ یہاں کی کنواری عورتیں اور وہ عورتیں جو شادی شدہ ہیں، عصمت کے معاملہ میں انتہائی بلند معیار پر ہیں''۔

یوسف عزیز مگسی اس تقابلی جائزہ کے بعد یہ مطالبہ کرتا ہے کہ عورتوں کو وہ تمام حقوق عطا کیے جائیں جو اُن کو بطورِ انسان ملنے چاہئیں۔

''آپ حیران ہوں گے، جب ایک کنواری یورپین لڑکی ایک دو بجے تک گھر سے باہر آپ کے ساتھ کسی پارک میں تنہا بیٹھی ہوئی ہے اور مختلف موضوعات پر بحث ہو رہی ہے۔۔۔ ممکن ہے شعر وشاعری یا محبت وغیرہ پر ہی بحث ہو، ممکن ہے وہ آپ کے ساتھ اقرارِ محبت بھی کرے۔ مگر کیا مجال ہے کہ ایسی رومانٹک فضا میں، یورپ کی زندہ کن فضا میں، تنہائی، نیم شب کا وقت، ایسے وقت میں بھی اس کا خیال ایک لمحے کے لیے بھی عصمت فروشی کی طرف منتقل ہو۔ اگر بے وقوفی سے آپ کا خیال اس طرف منتقل ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اپنا وقار، اپنی اخلاقی حالت کو اس کی نظروں میں مجروح کر دیا۔ یہ ہے یہاں کی اخلاقی حالت۔ آپ کے مولویوں کی بنائی ہوئی عورت پردے میں رہے گی، مرد کی شکل نہ دیکھ کر محض نظر کی جبریت پر عامل ہوگی، وہ مذہبی، دیندار، نمازن کہلائے گی، مگر معاف فرمائیے گا کہ پچاس فیصدی، جب ورثا کی غیر حاضری میں آنکھ کا کوئی

اشارہ ملے گا، تو ہمہ تن خون ہو کر بہہ جائے گی:

نکو رو تابِ مستوری ندارد
بہ بندی درز روزن سر برآرد

''یہ ہے نتیجہ پابندیوں کا۔ جذبات و خیالات، جو رسم و رواج کی پابندی سے راہ نہیں پاتے، وہ عورت کو باغی، عیاشی کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ وہ Day Dreaming میں اوقات بسر کرتی ہے اور یہ دماغی عیاشی اس کے کیرکٹر کو بہت نازک اور ناپائیدار بنا دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذرا سے اشارے کی، یا ذرا سی ترغیب کی دیر ہوتی ہے اور ورثا کی غیر حاضری کا موقع' بس پھر آپ جانتے ہیں۔

''یہاں کی عورتیں ہر قسم کی آزادی سے بہرہ ور ہیں۔ مردوں سے کھیلتی ہیں، ننگی ٹانگیں رکھتے ہوئے بازار میں پھرتی ہیں، دریاؤں میں تیرتی ہیں، جس چیز کو اچھا سمجھتی ہیں، انہیں خوف نہیں ہوتا کہ والدین مزاحم ہوں گے، آزادانہ تعارف پیدا کر کے سیر کرتی ہیں۔ اس کی وجہ سے انھیں دماغی عیاشی کی اُس بدترین شکل سے واسطہ نہیں پڑتا جیسا آپ کے علاقے میں، سمجھتی ہیں۔ عصمت کو صرف اُس کے لیے سمجھتی ہیں جو کہ ان کی زندگی کا رفیق ہو، وہ بھی باقاعدہ نکاح کے بعد، پہلے نہیں۔ شاذ و نادر۔۔۔ ہاں! میں نے شاذ و نادر کہا اس لیے کہ محض ناتجربہ کار، مردوں کے وعدہ شادی میں آ کر عصمت پہلے ضائع کرتی ہیں، مگر یہ معاملہ بہت کم ہے اور کم ہو رہا ہے''۔(5)

عورتوں کے حقوق کے بارے میں ایک اور خط کے اندر وہ اپنے رفیق کامریڈ محمد امین کھوسہ کو لکھتے ہیں: ''آپ میرے جذبات سے قدرے آگاہ ہیں۔ ایک بے یار و مددگار فرد ہوں اور تقریباً اقتدار پرست بلوچوں کا اعتماد بھی کھو چکا ہوں۔ مگر پروا نہیں۔ انشاءاللہ اگر الاعمال بالنیات کا مقولہ صحیح ہے تو ایک دن آئے گا جب بلوچوں کو مظلوم لڑکیوں کے حقوق دینے ہوں گے۔''(6)

یوسف عزیز مگسی نے سماجی امور میں عورتوں کی شمولیت کی اہمیت، کبھی فراموش نہ کی۔ وہ بلند آواز سے کہتا رہا: ''آزادی کا حصول بلوچ خواتین کی شمولیت کے بغیر ناممکن ہے''۔

یہ محض زور بیاں، خالی خولی تقریریں نہ تھیں بلکہ اپنے نظریات پہ مصمم و مستحکم یوسف عزیز

مگسی نے تو حتیٰ کہ اپنے وصیت نامے میں لکھا:

''میری تمام جائیداد منقولہ و غیر منقولہ کا نصف حصہ مساوی طریق پر میرے بھائی والدہ، بیوی، اور منے سیف اللہ پر تقسیم ہونا چاہیے''۔(7)۔ مجھے اُس کے استعمال کردہ لفظ ''مساوی'' پر زور دینا ہے۔ اور مجھے یوسف عزیز مگسی کے 1935 میں انتقال کے بعد سے آج تک اُن لوگوں کی لسٹ مرتب کرنی ہے جنھوں نے ایسی وصیت کی ہو۔ بھلا وہ کتنی طویل لسٹ ہوگی؟!۔

5۔ سوشلزم

1933 کے اواخر یا اگلے سال کے اوائل میں امین کھوسو کو ایک خط میں یوسف یوں لکھتا ہے:

''بھائی صاحب! یہ سارے حصہ دار ہیں، جھگڑا صرف حصہ بانٹنے کا ہے۔ یہ سرمایہ دار ایک دوسرے کو پلیٹ فارم پر دھمکیاں دے کر اپنے لیے اچھا حصہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ غریبوں سے لوٹ کھسوٹ کی بندش کا افسوس اور غم نہ تو ہماری کانفرنس والوں کو ہے اور نہ آپ کی خاص نیشنل کانگریس کو۔ میں تو اس موجودہ تحریک سے مایوس ہوتا جا رہا ہوں اور کوشش میں ہوں کہ بلوچستان کے اندر کوئٹہ، جھل، سبی، نوشکی اور مستونگ میں کسانوں اور مزدوروں کی ایک یونین بن جائے جس کے مقاصد، محاصل اور بٹائیوں کی ظالمانہ لوٹ کو معتدل درجے پر لانے کے لیے سرمایہ داروں سے اپنے حقوق حاصل کرنا اور مزدور کے لیے، جن میں ریلوے کی تعمیرات کے ہر قسم کے مزدور ہوں، اجرت کے نرخ اور اوقاتِ کام کو مناسب سطح پر لانا ہو۔

''اگر بدقسمتی سے قدرت نے مجھے مہلت نہ دی اور میرا خیال میرے دل کے اندر رہ گیا تو میں اس محبت کے نام پر، جو آپ کو اس ناچیز بھائی کے ساتھ ہے، درخواست کروں گا کہ پھر آپ کو ہی اس شیطانی لعنت کے خلاف کام کرنا ہوگا۔

''ہمیں اصلاحات، کونسل، گورنری، صوبہ کیا فائدہ دیں گے۔ علاوہ اس کے کہ غیر ملکی

سرمایہ داروں کی جگہ ملکی سرمایہ دار ہیں۔ 95 فیصدی بلوچستان کی غریب آبادی کے لیے تو سوراج (آزادی) تب ہوگا جب وہ اس لوٹ سے بچیں۔ خدا آپ کو اس بڑے انسانی کام کے لیے زندہ رکھے، اور مصائب برداشت کرنے کی ہمت دے۔'' (8)

یوسف عزیز مگسی غریب مزدوروں کسانوں اور پسے ہوئے طبقے سے محبت کرتا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ محنت کش طبقے کو متحد کر کے ان کو ان کے حقوق دلائے جو جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے مختلف حیلوں بہانوں سے ان سے چھین رکھے ہیں۔ وہ سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کو شیطانی لعنت کہتا تھا۔

انسان دوست، ترقی پسند اور مزدوروں کے ساتھی یوسف عزیز مگسی نے ایک اور خط میں اپنے عزیز دوست محمد امین کھوسہ کو لکھا تھا؛ ''آج عید ہے، ہم بستر میں لیٹے ہوئے مزدور تحریک کی سوچ میں عید منا رہے ہیں۔ اور بستر کے دائیں جانب کارل مارکس کی داس کیپٹل پڑی ہوئی ہے''۔ (9)

یوں چلا وہ یوسف نے اسلام اور نیشنلزم میں ایک اور دوستانہ چپیڑ ڈال دیا؛ سوشلزم۔ اس نے انھیں یوں قریب کر دیا کہ یہ تینوں ایک دوسرے کو تقویت دیتی نظر آتی ہیں، ایک دوسرے کی ساتھی ہیں۔ یوں سمجھیے کہ یوسف عزیز نے اسلام، نیشنلزم اور سوشلزم کو بلوچستان میں انقلاب کی اساس و منزل قرار دیا تھا۔

آزادیوں سے محبت کرنے والے لوگ غیبی انداز میں کمیونزم کی طرف ہی آ جاتے ہیں!!

اس کے انگلستان کے سفر کی تفصیلات کا دو تین خطوط کے علاوہ کوئی ماخذ مجھے نہ مل سکا۔ لیکن ان خطوط سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ وہاں میر یوسف علی خان کی سوچ کو بہت وسعت نصیب ہوئی۔

برطانیہ میں اُسے صنعتی اور کیپٹل ازم والا معاشرہ دیکھنے کو ملا۔ اسے سیاست، ثقافت اور تمدن کے نشو و نما میں معیشت کے کلیدی رول کا احساس ہوا۔ یورپ سے متعلق اس کے دماغ میں موجود ساری رائے بدل گئی۔ اس نے ان نئے حقائق کو تسلیم کیا اور اپنے خیالات اپنے دوستوں تک

پہنچانے میں نہ تو کوئی ندامت محسوس کی، نہ ہی تامل کیا۔ ایک خط میں لکھتا ہے؛

''یورپ کے متعلق آپ کے علمایانِ دین کی تمام باتیں غلط، یکسر غلط، بخدا کہ غلط۔ یورپ بہت آزاد ہے۔'' (10)

برطانیہ میں وہاں کی کمیونسٹ پارٹی سے اس کا رابطہ ہوا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے جو لیڈی سیکرٹری رکھی وہ برطانوی کمیونسٹ پارٹی کی رکن تھی۔

''مگسی لندن میں محبت میں گرفتار ہوا تھا.....'' آیئے اس محبت کی بات کر ہی لیں؛

''اچھا اب رہا میں اور شاعری، مجھے تم جانتے ہو، سراپا شاعر۔ دس بجے سے لے کر چار بجے تک تو باقاعدہ کام کرنا پڑتا ہے کالج میں۔ اس کے بعد کبھی ہم جاتے ہیں تو کبھی ہمارے پاس اُن کو آنا پڑتا ہے۔ پُر لطف باتیں ہوتی ہیں، حسن کا قصہ بھی چھڑ جاتا ہے، عشق کا ساز بھی بجتا ہے، مگر ہندوستانی ساز نہیں۔ ہم اپنی مشرقی روح کے ترانے گا کر انھیں سناتے ہیں، وہ اپنے مغربی ساز کے بین بجا کر رومان طاری کرتی ہیں۔ مگر حاشا و کلا، جو معاملہ اس سے بڑھا ہو۔ ہاں! ایک بار ایک اکیس سالہ کنواری لڑکی نے شادی کا وعدہ لینا چاہا۔ ہم نے کہا کہ ہم بڑے خوش قسمت ہوں گے اگر آپ ہمیں منظور فرمائیں مگر آپ جانتی نہیں کہ ہمارا مستقبل سلوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیاں یا سیسے کی کوئی منجمد گولی کا شکار ہونا مقدر ہو چکا ہے، کیوں قسمت کو خراب کرتی ہو۔ اس کا اصرار اس کے ساتھ اور بھی بڑھا۔ فرمانے لگیں کہ اگر تمھارے اندر یہ ہمدردیِ ملک و قوم کا جذبہ نہ ہوتا تو میں شادی کے لیے ہرگز نہ کہتی۔ آپ کی ظاہری وضع اور شکل سے زیادہ باعثِ تحریک میرے لیے آپ کے جذبات ہیں۔

خیر! اس وقت تک تو ہم نے معاملہ زیرِ غور رکھا ہوا ہے۔ شریف ہے، معصوم ہے اور پیار کرتی ہے۔ ہم بھی کرتے ہیں مگر بھائی! حقیقت یہ ہے کہ ہم شادی کے قابل نہیں۔'' (11)

یوسف مگسی برطانیہ جلاوطنی میں وہاں ایک برس سے زیادہ عرصہ رہا۔ دلچسپ بات ہے کہ جب قادر بخش نظامانی 1934 میں خفیہ طور پر سوویت یونین گیا تو یوسف عزیز مگسی نے اس کی

زبردست حوصلہ افزائی کی تھی۔(12) چنانچہ اب خود اُس کا سوویت یونین جانے کا پکا ارادہ بنا۔ وہ چاہتا تھا کہ انگلینڈ جا کر وہاں سے اپنے خوابوں کے مرکز سوویت یونین دیکھ آئے۔(13)۔ ہو چی من کا یہ ارمان پورا ہوا، مصری خان کھیتران کی آرزو پوری ہوئی، مگر مگسی کو وہاں جانے کا موقع نہ ملا۔ یوں، ہمارا یہ بزرگ کئی دیگر نا تکمیل یافتہ عوامی سماجی حسرتوں میں اِس ایک بڑی حسرت کا بھی اضافہ کر چلا۔ اس نے سوویت یونین جانے کی بہت کوشش کی مگر اس میں کامیاب نہ ہوا۔

لندن جلاوطنی سے واپسی پر یوسف عزیز نے ایک زور دار مضمون بعنوان ''سیاسیات مقدم ہے یا اقتصادیات'' لکھا۔ پورا مضمون ابھی تک کسی کو نہیں ملا۔ بس اس مضمون کا ایک پیرا گراف کہیں سے ملا، اور وہ بھی اب یاد نہیں کہ کہاں سے۔ اس لیے کسی خاص ریفرنس دیے بغیر چھاپ رہا ہوں۔ دیکھئے:

''وہ اشخاص جو دو وقت کی روٹی پیٹ بھر کر کھانے کی استطاعت رکھتے ہیں، کیا انگلیوں پر نہیں گنے جا سکتے؟۔ ہمارے دیہات کی منتشر آبادی، جن کو نہ سونے کا ڈھنگ ہے، نہ کھانے کی تمیز اور پھر سردار پرستی، بیماریوں سے بھرے ہوئے غلیظ گھروں اور سال ہا سال کے پرانے کپڑوں کا، جو جراثیم کا آشیانہ بنے ہوئے ہیں، استعمال دردناک نہیں؟''۔

مگر مگسی صاحب کی یہ آواز ہماری کسی سیاسی پارٹی کی راہنمانہ بن سکی۔ ہم اس کی باتوں سے صرف اپنی سہولت کی باتیں اٹھاتے رہے۔ اپنے جلسوں میں کبھی گھمبیر اور کبھی گلوگیر آواز میں لہک لہک کر اُس کی نظمیں پڑھتے رہے مگر ہم نہ تو اپنی بچیوں کو تعلیم دلا سکے اور نہ عورتوں سے متعلق اپنے رویوں میں تبدیلی لا سکے اور نہ ہی انھیں برابری کے حقوق دینے کا ارادہ کر سکے۔

جلاوطنی سے واپسی کے بعد اُس کا ارادہ تھا کہ وہ متعدد محاذوں پر جہاد کرے گا جن میں آئینی و تعلیمی اصلاحات، سرداری نظام کا خاتمہ، اور اسلامی تعلیمات کی ترویج شامل ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں انہی مقاصد کے حصول کے سلسلہ میں لکھتا ہے:

''مقام حمد و ثنا اور موقع فخر و مباہات ہے کہ بلوچ اور بلوچستانی بھی جاگے۔ نہ صرف بستروں پر اللہ تعالیٰ کا نام جپنے کے لیے، بلکہ میدانِ عمل میں بھی آئے ہیں اور ایک ایسے عزمِ کامل

اور یقینِ واثق کے ساتھ آئے ہیں جس کا اعتراف خود قوائے باطلہ کو بھی ہے۔ اگر چہ اُن کا اعتراف واظہار دبی زبان سے کیا جا رہا ہے''۔

جیسے کہ ذکر ہوا اس کی فکری ارتقا بڑھتی رہی۔ یہ اُس وقت بلند ترین سطح پہ آئی جب اُس نے اپنے ساتھیوں کو کسانوں اور مزدوروں کی طرف متوجہ کیا۔ حتیٰ کہ اُس نے اپنے ایک دوست کو ''بلوچستان مزدور پارٹی'' کے قیام کی تجویز دی۔

ظاہر ہے یہ ساری تھیوری حکمران طبقات کو پسند نہ تھی۔ اُس نے سرداروں کی محفل میں جا کر دیکھا تو جانا کہ وہ اسے اچھا نہیں سمجھ رہے تھے۔ اس کے اپنے بقول سرداروں نے اُس کو یوں دیکھا:

دل بہ مزدوراں بہ بست از ما گسست

نظریاتی ستھراپن اپنی معراج کو اُس وقت پہنچا جب اس نے اپنے دوست امین کھوسو کو ایک خط میں یوں لکھا:

''میں آپ کو ذیل کا ایک مشورہ ضرور عرض کروں گا۔ اگر آپ نے مانا تو میں بہت مشکور ہوں گا: کارل مارکس کی تصنیف The capital اور ''دنیا کے دس ہلاکت آفریں دن'' جو انگریزی میں ہے اور ایک انگریز سیاح کے قلم کی لکھی ہوئی ہے، ان کو ضرور دیکھیں۔

''اگر چہ مجھے احساس ہے کہ آپ میں فطرتاً بغیر کسی کی تقلید کے ایک مادہ اشراکیت کا ہے، اور غریبوں، کسانوں، مزدوروں کے لیے لڑنے والا دل، مگر ساتھ اس کے یہ چیزیں ٹھوس بنیادوں پر اس مادے کی تعمیر کریں گی''۔(14)

یوں ہم نے دیکھا کہ رفتہ رفتہ ارتقا کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے یوسف کا ذہنی میلان بتدریج سوشلزم کی طرف گامزن رہا۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اس نے اپنے دوستوں کو خطوط کے ذریعے انجمن سے برطانیہ نواز عناصر کو باہر نکالنے، اور خود کو بلوچستان کی مکمل آزادی اور ایک سوشلسٹ نظام کے لیے وقف کرنے کے منصوبوں کے بارے میں آگاہ کیا۔(15)

میر یوسف علی عزیز مگسی اپنے مطالعے اور تلخ سیاسی تجربات سے اخذ کردہ شعور کے ہاتھوں انگریز اور سردار دونوں کے خلاف ہو جاتا ہے۔ اور علی الاعلان اپنا مؤقف بیان کرتا ہے۔

بادہِ کھن نامی اپنی نظم میں میر مگسی بلند آہنگ انداز میں یوں شاعری کرتا ہے:

مستیِ مانہ زصہبا ست نہ زِجام است این جا
بے خبر بادہ و پیمانہ کدام است این جا
غم نہ داریم ز تاریکیِ شبہائے فراق
داغِ حسرت صفتِ ماہ تمام است این جا
پرکاہیم و نداریم ز طوفان باکے
میلِ غم نیست اگر تندحرام است ایں جا
سفرِ عشق نہ منزل نہ مقامے دارد
رفعتِ عرش درایں راہ دوگام است اینجا
ابرِغم مطلع مارا نہ گرفت است چناں
کہ بدانیم اگر صبح کہ شام است ایں جا
ساقیِ من کہ مرا داد دوچشمِ پُرنم
کرد اشارت کہ نصیبِ تو دو جام است ایں جا
ہر کجا مِی نگرم جلوہ نما افرنگ است
مصرو ایران و عراق این ہمہ نام است اینجا
ازسر افگندگیِ خویش نداریم غمے
گفت یوسف پئے ہر سجدہ قیام است ایں جا

دلچسپ بات یہ ہے کہ انگلینڈ کے اپنے سفر کے بعد یہ شاعری مکمل طور پر عوامی بن گئی۔ انگلینڈ (لاہور شہر کی طرح) ایک عجب ملک ہے۔ ایک طرف دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس نے امریکہ سے لے کر بلوچستان تک سب کو اس نے اپنا غلام بنائے رکھا تھا۔ اور یہ سارا خطہ اُس انگلینڈ کی جہالت اور نفسیاتی بیماری کے خلاف جنگِ آزادی لڑ رہا تھا۔ مگر دوسری طرف دیکھیے تو یہی انگلینڈ اور اس کا دارالخلافہ لندن اچھے انسانوں کی راہنمائی بھی کر رہا تھا۔ کارل مارکس اور اینگلز اگر وہاں کی

لائبریری اور مزدور بستیوں کو گہرائی سے نہ پرکھتے تو ''کماڈٹی'' پہ اُن کی ''شاعری'' اس قدر پُر مغز نہ ہوتی۔ لینن اپنی جلاوطنی اُس صنعتی ملک میں نہ گزارتا تو اس کا انقلابی نظریہ موضوعیت سے بچنے کے لیے بہت سال خرچ کرواتا۔

یہی حال یوسف عزیز مگسی کا تھا۔ یہ موہوم و مدہم اطلاع بھی درست ہے کہ وہ وہاں پر برطانوی کمیونسٹوں کے زیر اثر آچکا تھا۔ مگر ایسا نہ بھی ہوتا تو بھی خود وہاں کا علمی ثقافتی ماحول اُس کی دنیا بدل ڈالنے کو کافی تھی۔ اس نے وہاں کی کچھ باتیں اپنی تحریروں میں لکھی ہیں۔ وہاں عورت کی حقوق یافتگی کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں۔ مگر اُس کے دیگر موضوعات میں عام انسان کی بنیادی ضرورتوں اور مسائل کے حوالے زیادہ آنے لگے۔ وہ سوشلزم کا باقاعدہ حامی بنتا گیا۔ سوشلزم جو نجات کی راہ تھی۔ وطن کی آزادی سوشلزم کے بنا تو گویا گورے انگریز سے کالے انگریز کی حکمرانی تھی۔ (اور ہے!)

اسلام اور پان اسلام ازم تو اس کے بچپن، لڑکپن اور جوانی کی زندگانی کا ایک ایسا حصہ تھا جو کبھی دھیما نہ پڑا۔

دوسری چیز اس میں بلوچ نیشنلزم تھی۔ یہ ایک موجیں مارتا سمندر تھا۔ یہ نیشنلزم پہلے پہل تو محض قوم کی بہبود کے عزم اور حسرت لیے ہوئے تھا مگر بعد میں جب اُس میں سیاست شامل ہوتے ہوتے مارکسزم بھی جگہ پا گیا تو وہ صورت بنی جس پہ آج تک بلوچ تحریک چلی آرہی ہے۔ اس نے کمال ہنرمندی کے ساتھ اسلام، بلوچیت اور مارکسزم کو ملا کر انھیں اپنی جدوجہد کا حصہ بنا ڈالا۔ میر یوسف عزیز کی صدائے حق نے انگریز کی تمام جکڑ بندیوں کو توڑ دیا۔ اس کی للکار بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ اس کے خیالات وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے گئے اور اس کے حامی بڑھتے چلے گئے۔ آہ! علامہ اقبال اور بعد میں اس کے حامی بم پھاڑ لوگ نہ ہوتے تو آج بھی بلوچ آنکھیں بند کر کے مگسی صاحب کی اس تین نکاتی راہ کو خوشی خوشی اپنائے ہوئے ہوتے۔ فکری موشگافیوں، مباحثوں، مناظروں کی اٹھکیلیوں سے ہٹ کر معروض تو دیکھیے تو اگلے سو سال تک بلوچ کو اُسی کے نقشِ قدم پر چلنا ہوگا۔ یعنی اسلام، بلوچ نیشنل ازم اور مارکسزم کو ملا کر سیاست کرنا۔

گوکہ آج تینوں کے الگ الگ ایجنسی ہولڈرز پیدا ہو چکے ہیں اور یہ ایجنسی ہولڈرز کبھی بھی ان تینوں باتوں کو ملا کر چلنے کے خلاف تباہ کن ردِعمل دیتے ہیں۔ ایجنسی ہولڈرز تو سیاست کبھی نہیں کرتے، مجاوری کرتے ہیں۔ مگر بلوچ اور بلوچستان سے پیار کرنے والے سیاست دانوں کو پلٹ پلٹ کے مگسی کے تکون کی طرف واپس آنا ہوگا۔

ریفرنسز

1۔ امین کھوسہ کے نام خط، 8 اپریل 1932۔ یوسف مگسی کے خطوط۔ یوسف عزیز مگسی چیئر، بلوچستان یونیورسٹی

2۔ مری، شاہ محمد۔ یوسف عزیز مگسی کے خطوط۔ صفحہ 128

3۔ یوسف عزیز مگسی کے خطوط۔ صفحہ 112

4۔ یوسف عزیز مگسی کے خطوط۔ 2017۔ صفحہ 127

5۔ یوسف عزیز مگسی کے خطوط۔ صفحہ 118

6۔ یوسف عزیز مگسی کے خطوط۔ صفحہ 81

7۔ مگسی، یوسف عزیز۔ وصیت۔ یوسف عزیز کے خطوط۔ صفحہ 58

8۔ مری، شاہ محمد۔ یوسف عزیز کے خطوط۔ صفحہ 100

9۔ مری، شاہ محمد۔ یوسف عزیز کے خطوط۔ صفحہ 65

10۔ کوثر، انعام الحق۔ مکاتیبِ یوسف عزیز مگسی۔ صفحہ 75

11۔ مری، شاہ محمد۔ یوسف عزیز کے خطوط۔ صفحہ 82

12۔ نظامانی، قادر بخش۔ عبدالرسول نظامانی کو دیا گیا انٹرویو۔ ماہنامہ سنگت۔ اگست۔ 2008

13۔ ایضاً۔ سنگت ستمبر 2008

14۔ خط بنام امین کھوسہ۔ یوسف عزیز کے خطوط۔ 2017۔ یونیورسٹی آف بلوچستان۔ صفحہ 99

15۔ بلوچ، عنایت اللہ۔ غیر مطبوعہ مضمون... The Baloch question in Pakistan۔ صفحہ 192

قلم ہتھیار

کمٹ منٹ، کمٹ منٹ، اور کمٹ منٹ .....اُس دور کے سب فکری دوست ایک جیسے تھے۔اور یوسف ان کا امام تھا۔

اُس کی سب تحریریں اتنی نمکین، اتنی تازہ اور دلکش ہیں کہ بار بار پڑھنے کو جی کرتا ہے۔ مثلاً مگسی صاحب امین کھوسہ کے طرزِ تحریر کی اس طرح تعریف کرتا ہے؛''واللہ آپ کے خطوط ایسے چٹکلے دار اور علیگ زدہ ہوتے ہیں جن کی تعریف کے لیے جی چاہتا ہے.....''

ایسے ہی دل کو تسلی دینے اور کبھی کسی مہربان کی دلجوئی کے لیے لکھ دیا کرتا؛''آپ اب خوش رہیں کہ مجھ میں اب وہ دیوانہ سری جو کہ تھی نہیں رہی۔البتہ اس کا خمار ہے''۔

سچی بات یہ ہے کہ یوسف زندگی کی آخری سانس تک اسی پاک خمار کی حالت میں رہا۔

مگسی صاحب کا اولین سیاسی مقالہ''فریادِ بلوچستان'' ہے۔اس کے بعد اس نے پیغامِ عمل، سوگند، بلوچستان کی بیداری اور سرمایہ داروں کی سراسیمگی، اور، جیو اور جینے دو لکھے۔اُس کی آخری سیاسی تحریر اس کی موت سے ذرا قبل آئی؛''سیاست مقدم ہے یا اقتصادیات''۔اس کی شاعری تو بہت خوبصورت ہے۔

الف: صحافت

ٹی وی چینلز، انٹرنیٹ، فیس بک اور ٹوئیٹر آج کے زمانے کے اوزار ہیں۔ان سے پہلے کے زمانے میں کسی بھی سیاسی تحریک کے لیے اس کے ترجمان اخبار کا ہونا بہت ضروری ہوتا تھا۔ میر یوسف عزیز اُس مکتبِ فکر سے تعلق رکھتا تھا جو ایک سیاسی اور جمہوری جدوجہد کے ذریعے بلوچ عوام کے حقوق حاصل کرنا چاہتے تھے۔لہٰذا اس کو اپنی تحریک کے لیے اخبار کی ضرورت کا شدت سے احساس رہا۔میر یوسف عزیز مگسی ہر وقت ایسے اخبارات کی سرپرستی کرتا رہا جو سیاست کی بالادستی اور بنیادی انسانی حقوق کے لیے لکھنے کی پالیسی رکھتے تھے۔

یوسف مگسی بہت کمٹ منٹ والا انسان تھا۔قید و بند کی صعوبتیں، جرمانے اور قسم قسم کی مشکلات اس کے عزائم کو کبھی بھی کمزور نہ کر سکیں۔مئی 1933 میں اس نے''بلوچستان کی آواز'' کے نام سے ایک پمفلٹ طبع کرا کے برطانوی پارلیمان لندن کو بھجوایا۔عوام کے مطالبات اور مسائل کی خاطر بلوچستان کا پہلا اخبار''بلوچستان'' بھی اُسی کی کوششوں سے وجود میں آیا۔اس کے بعد علی الترتیب''البلوچ''،''بلوچستان جدید'' اور''ینگ بلوچستان'' جاری ہوئے۔اُس کے ان سارے

اخبارات کا مرکز کراچی تھا اور اُن سب کا سرپرست یوسف عزیز ہی تھا۔ (1) ان سب اخبارات کے اخراجات مگسی صاحب ادا کرتا تھا۔

اس کا اچھا ساتھی خان عبدالصمد خان اچکزئی اُس کے اس عمل کو یوں بیان کرتا ہے:

''میرے میٹھے ساتھی نوابزادہ یوسف علی خان مگسی بہت دولت مند تھے اور بہت بڑے دل کے مالک بھی۔ پارٹی اور قومی کاموں پر بہت زیادہ اور عموماً بدخرچی کی حد تک خرچ کرتے تھے۔ پنجاب کے زمیندار اور انقلاب نامی اخباروں پر بہت خرچ کرتے تھے۔ ان اخباروں پر انھوں نے تقریباً 25 ہزار روپے خرچ کیے ہوں گے [اُس زمانے کے 25 ہزار!! مصنف]۔ پھر مولانا عبدالباقی اور باری کی سربراہی میں ایک الگ اخبار ''آزاد'' لاہور سے بڑے پیمانے پر نکالا اور اس پر بہت زیادہ پیسہ لگایا۔ ظاہر ہے یہ اخبار بے انداز فضول خرچی کی وجہ سے نہیں چلا اور چند مہینوں میں بند ہو گیا''۔(2)

لیکن یوسف کو اخبار اپنے کاز کے لیے ایک بہت اہم اوزار لگتا تھا۔ آپ اندازہ کریں کہ جب 1933 میں لاہور کا ''زمیندار'' اخبار بند ہونے کے بعد دوبارہ شائع ہونا شروع ہوا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے ایڈیٹر کو مبارکباد کا یہ پیغام بھیجا:

خدا کا تشکر ''زمیندار'' پھر ہوا جاری
یہ آفتاب بصد آب و تاب پھر نکلا
چُنا ہے جس کے لیے اس کو رحمتِ حق نے
اس امتحان میں یہ کامیاب پھر نکلا!
عزیز خُم مئے آزادیِ وطن کے لُنڈھا
پلانے تجھ کو یہ ساقی شراب پھر نکلا
(3)

جب مگسی صاحب کے کہنے پر اس کے اخبار نویس ساتھی محمد حسین عنقا نے ایک اور اخبار ''ینگ بلوچستان'' کراچی سے جاری کیا۔ تو اس نئے اخبار کے شمارہ اوّل کے لیے یوسف عزیز نے لندن سے دس صفحات پر مشتمل ایک یادگار مضمون ارسال کیا:

''جلسے جلوس، جماعت بندی، اخبار نویسی یہ سب جمہوریت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ فرنگی استبداد کا یہ حال ہے کہ ہمارے رفقا کو قید و بند میں ڈال دیا گیا ہے اور ہمارے ہمدردوں کو بے روزگار کیا گیا ہے۔ دربار سی سے خطاب کیا جاتا ہے کہ چند شورش پسند اٹھے ہیں جو بلوچستان کی پُرامن فضا کو مکدر اور اُس کے سکون کو درہم برہم کرنا چاہتے ہیں۔۔۔''(4)۔

***

مگسی صاحب کے جاری کردہ اخبارات کا تعارف یوں ہے:

(یہ سارا تعارف محمد حسین عنقا کا ہے جو میں نے اس کے ہفت روزہ اخبار ''بلوچستان'' کراچی کے 16 جنوری 1939 سے لیا، صفحہ نمبر 18 سے)

1۔ البلوچ

جس وقت یوسف عزیز کو ملک بدر کر دیا گیا، اور تو اُسی وقت اُس کی سب سے بڑی اور مؤثر آواز یعنی ہفت روزہ ''البلوچ'' کو بند کر دیا گیا۔ ''البلوچ'' انجمن اتحادِ بلوچستان اور آل انڈیا بلوچ کانفرنس کا ترجمان اخبار تھا۔ پورے برصغیر میں موجود بلوچوں کو جوڑنے والا، نظریہ اور سیاسی لائن دینے والا اخبار۔ اس کا بند ہو جانا ناقابلِ تلافی نقصان تھا۔

2۔ بلوچستانِ جدید

البلوچ بند ہو گیا تو اُس کا نعم البدل تو سوچنا تھا۔ اخبار کے بغیر تو تحریک بے معنی ہو جاتی۔ بالخصوص ایسے وقت جب عبدالصمد اچکزئی اور عبدالعزیز کرد جیل میں تھے۔ اور ڈیکلریشن آسانی سے نہیں مل سکتی تھی۔ اور بالخصوص سرکار کے لیے ناقابلِ قبول شخص کے نام تو بالکل بھی نہیں مل

سکتی تھی۔ یوسف عزیز اخبارات کے رول کو اتنی اہمیت دیتا تھا کہ اس نے حتیٰ کہ ایک محبِّ وطن ساتھی اور سکول ٹیچر پیر بخش عرف نسیم تلوی کو کراچی بھجوادیا تا کہ وہ وہاں سے ایک اخبار نکال سکے۔ نسیم تلوی بلوچستان سے کراچی آیا۔ چنانچہ یہ فیصلہ ہوا کہ نسیم تلوی کے نام سے اخبار کے ڈیکلریشن کے لیے درخواست دائر کی جائے۔

یوں ''بلوچستانِ جدید'' جاری ہوا۔ ''بلوچستانِ جدید' ایک ہفت روزہ اخبار تھا۔ جہازی سائز والا۔ یکم مارچ 1934 میں اس کا پہلا شمارہ نکلا۔ ایڈیٹر نسیم تلوی، ڈپٹی ایڈیٹر محمد حسین عنقا۔

اُس ''بلوچستان جدید'' کے جاری کرنے کا مقصد یہ تھا کہ بلوچستان کے حق میں بلوچستان سے باہر پروپیگنڈا کیا جائے اور ہمسایہ ممالک میں ہمدردفضا پیدا کی جائے۔ نیز یہ بھی کہ خود بلوچستان کے اندر لوگوں کو ان کے حقوق اور مطالبات سے آگاہ کیا جائے اور ان میں سیاسی بیداری پیدا کر کے انہیں ایک مرکز پر جمع کیا جائے۔

بلوچستان جدید کے اولین شمارے میں درج تھا: ''بلوچستان جدید جیسے کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، ایک ایسے بلوچستان کا پیامبر ہوگا جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح اصلاحات سے پورے طور پر مستفید ہوگا اور جس کے باشندے اس کی حکومت میں برابر کے حصہ دار ہوں گے۔ بلوچستانِ جدید سوئے ہوئے باشندوں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کرے گا اور انھیں آنے والی زندگی کی دوڑ کے لیے تیار کرے گا۔ اور یوں بلوچستان کو بھی دوسرے صوبجات کے دوش بدوش چلانے کی کوشش کی جائے۔''

نظم ''عافیت کوش احباب سے'' اِس اولین شمارے کے سرورق کی زینت بنی۔ اس ہفت روزہ کے اولین شمارے کے اداریے میں یوں لکھا تھا:

''دنیائے جدید، مذہبی سیاسی اخلاقی تعلیمی اور اقتصادی لحاظ سے بہت ترقی کر گئی۔ مگر بلوچستان اِن اعتبارات سے نہ صرف پیچھے ہے بلکہ اس قدر گرا ہوا ہے کہ آج صفحۂ دنیا کی مہذب آبادی اس کے نام تک سے واقف نہیں۔ بلوچستان کی آج ٹھیک وہی حالت ہے جو قرونِ وسطیٰ میں موجود دنیا کی تھی۔ اس کا عجیب وغریب اور دنیا سے نرالا طرزِ حکومت، اس کا دقیانوسی جرگہ

سسٹم، اس کے گمراہ کن رسم ورواج، اس کے باشندوں کی مذہبی اخلاقی تعلیمی اور اقتصادی زبوں حالی آثارِ عقیقہ سے کسی طرح کم نہیں۔

''اے خدا! اے آسمانوں اور زمینوں کے خدا! اے غریبوں اور مظلوموں کی مدد کرنے والے خدا! اے حق اور اس کے حامیوں کی حمایت کرنے والے خدا! تو ہماری مدد کرنا۔ ہم بے کس ہیں، ہم مظلوم ہیں۔ ہماری تمام امیدیں تجھ سے وابستہ ہیں۔ اے خدا، تو ہم کو سچ کہنے والی زبان اور سچ لکھنے والا قلم عنایت فرما۔ ہمیں نیکی کرنے کی طاقت عنایت کر۔ اے خدا! ہمیں حق سننے والے کان، نیکی دیکھنے والی آنکھیں، دوسروں کی تکلیف پر بے قرار ہونے والا دل عطا فرما۔ اے قادرِ مطلق، اے رحیم وکریم خدا! تو ہمیں ہمارے مقدس مذہب اور پاک وطن کی خدمت کرنے کی توفیق دے''۔

ان دنوں جب ہر طرف سے زبان بندی کا تاریک دور اپنے عروج پر تھا تو کراچی سے جب یہ اخبار ''بلوچستان جدید'' کا اجرا ہوا تو اس پر مسرت موقع پر شیر علی بنگلزئی نے خیر مقدمی کلمات اپنے ان اشعار میں کیا خوبصورتی سے بیان کیے؛

روزِ میمون ساعت ِخوش شد ہویدا ہچو عید
گردشِ افلاک رفت آمد بلوچستان جدید
ہاتفِ غیبی بگوش ہوش آورد این نوید
بربلوچستان رخشاں شد عجب نجمِ سعید
افتتاحِ باب آزادی بشد از حکم رب
آخرش ریحان بدست آمد پس ازمدت مدید
فضل ِ مولا شاملِ حالِ بلوچستان است
شد عجب اخبار ما از چاپلوسی ہا بعید
برگلستانِ بلوچستان نسیمے آمدہ
حالت پژمردہ مارا بدید و ہم شنید

ہمت عنقائے مارا باد صدہا آفرین
کرد حبِ قوم مجبورش محن از کس ندید
اے علی وردِ زبان کن مصرع حافظ مدام
ابرآزادی برآمد بادِ نوروزی وزید

اس میں کوئی شک نہیں کہ بلوچ سامراج دشمن قومی تحریک کے اوائلی دور میں دہلی، علی گڑھ، لاہور اور ملتان کا بھی اچھا خاصا اثر رہا۔ مگر کراچی کا شہر اور اس کی اشاعتی سہولیات اُسی زمانے سے بلوچ ادبی وسیاسی زندگی میں اہم کردار ادا کرتی چلی آرہی ہیں۔

اس ہفت روزہ کے پہلے شمارے (یکم مارچ 1934) پر مگسی صاحب کا پیغام چھپا ہے:

۔۔۔''میں اس اقدامِ مستحسنہ پر جہاں آپ دونوں کو اپنے قلب کے عمق سے نکلا ہوا ہدیہ تہنیت پیش کرتا ہوں وہاں اہلِ بلوچستان سے بھی انسانیت، قومیت، اور وطنیت کے مقدس اور عزیز نام پر اپیل کروں گا کہ وہ فراخ دلی سے اس ننھے قومی جریدہ کا استقبال کرتے ہوئے اس کی قلمی اور درمی امداد کریں۔

''میری قلبی آرزو ہے کہ 'بلوچستان جدید' پھلے پھولے اور حقیقی معنوں میں بلوچستان کے لیے آنے والے عہدِ جدید کا پیامبر ہو۔''

مگر جلد ہی بلوچستان جدید بھی زیرِ ضمانت آکر ''البلوچ'' کی مانند ختم ہوا۔

اسی اثنا میں عنقا صاحب کے بھائی محمد حسن نظامی کو سیاسیات میں حصہ لینے کے جرم میں ملازمت سے برخاست کیا گیا اور یوں عنقا کی مصیبتوں میں اور اضافہ ہوا۔ اس نے اس تمام صورت حال سے نواب یوسف علی خان مگسی کو لندن میں خط لکھ کر آگاہ کیا۔ مگسی نے چھ سو روپے اس ہدایت کے ساتھ اُسے بھجوا دیے کہ ''تم (عنقا)، نسیم اور نظامی آپس میں بانٹ کر کھاؤ۔ اور میرے آنے تک گزارہ کرو۔ میں (نواب یوسف علی خان) دسمبر تک آجاؤں گا۔'' یہ مہینہ ستمبر کا تھا۔

3- ینگ بلوچستان

نسیم تلوی اور عنقا نے عیسیٰ نامی ایک بلوچ کے اخبار ''ینگ بلوچستان'' کی خدمات حاصل کیں اور ہفتہ وار کی بجائے اُسے سہ روزہ کیا۔ لیکن پھر عیسیٰ ان سے علیحدہ ہوگیا۔ اور نوبت مقدمہ بازی تک پہنچی اور میر غلام محمد دریا خان نے ان کی قومی راہ میں یہ روڑا دیکھا تو اس سے برداشت نہ ہوسکا۔ اور اُس نے اپنی خدمات پیش کیں۔

4- نجات

چنانچہ غلام محمد دریا خان کے نام پر اخبار ''نجات'' کا ڈیکلریشن داخل کیا گیا اور پھر زور وشور سے کام جاری کیا گیا۔ محمد ایوب خان اچکزئی نے حسبِ وعدہ اجرائے اخبار پر اپنے جمع کردہ چار سو روپے بھیج دیے تھے۔ محمد حسن نظامی نے بھی اپنے حصے کا مطالبہ نہیں کیا۔ کیونکہ عنقا صاحب اپنے تمام ذاتی زیورات بیچ کر نظامی کو اُس کے برخواست ہونے پر ہی دے چکا تھا۔

اخبار سہ روزہ کر دیا گیا تھا۔ اس لیے اس کا خرچ بڑھ چکا تھا۔ حکومت بلوچستان تشدد پر اُتر آئی تھی۔ جو اخبار خریدتا تھا، اُس پر قیامت بپا کی جاتی تھی۔ اس لیے خریداروں کی جانب سے اخبار کی آمدنی سُست پڑ گئی تھی۔

5- الحنیف

نسیم تلوی کراچی سے جیکب آباد چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے ''الحنیف'' بلوچستان ایڈیشن جاری کیا۔

6- ہفت روزہ ''بلوچستان''

عنقا صاحب کی اصلی تنخواہ کا کچھ حصہ مرغزانی کے ذمے تھا۔ اس نے اپنی اس تنخواہ کا

مطالبہ کیا اور مرغزانی نے اسے یہ تنخواہ دے دی۔ یہ کل بیالیس روپے کی رقم تھی۔ عنقا نے بسم اللہ کر کے اسی سرمایہ سے اخبار ''بلوچستان'' جاری کیا۔

ب۔افسانہ

یوسف عزیز مگسی نے صرف ایک افسانہ لکھا: تکمیل انسانیت۔

1908 یوسف عزیز مگسی کی پیدائش ہے اور اِس افسانے میں 1930 تک کے واقعات ہیں۔ یہ افسانہ مگسی صاحب کی زندگی کے ابتدائی اکیس برسوں کی سرگزشت ہے۔ اور یہی تو اُس کی سیاست کے اینٹ گارے اکٹھا کرنے کے سال تھے۔ یہ افسانہ اپنے عہد کے سیاسی رویوں، آزادی کی تمنا، حب الوطنی، مذہبی لگاؤ، اور اجتماعی طرزِ احساس کا علمبردار ہے۔

باپ نے اُس کو برباد کرنے کے سارے انتظامات کر ڈالے تھے۔ اس لیے کہ اُسے باقاعدہ سکول نہیں بھیجا، اور دوسرے نوابوں کی طرح کرائے کے ماسٹر اور مولوی منگوا کر گھر میں مروج تعلیم دلائی تھی۔ دلچسپ بات ہے کہ بلوچستان میں سردار، اگر مرجاتا تو انگریز اُس کے بیٹوں کو اپنی ذمہ داری پہ سکول میں پڑھاتا، مگر زندہ باپ بیٹے کو ایسے ہی خانہ بدوش معلمین کے حوالے کرتا تھا۔ یوسف اپنے افسانے میں تقریباً ماتم اور بَین کے انداز میں سکولی تعلیم نہ ملنے کا تذکرہ کرتا ہے۔ نواب زادوں سے ''نوکری نہ کروانے'' اور ''اسلاف کی روایات کے لیے انگریزی تعلیم مضر ہے''

جیسی ڈینگوں بھری عادتوں میں ڈوبے ہمارے نواب، ہمارے سماج کے ارتقا میں سب سے بڑی رکاوٹ رہے۔

میر یوسف عزیز مگسی کا افسانہ اُس زمانے کا احاطہ بھی کرتا ہے جب اُس کے باپ نواب کیسر خان کو ریاستِ قلات کے حکمرانوں نے انگریزوں سے مل کر سیاسی ناپسندیدگی کی وجہ سے ریاست بدر کر دیا تھا۔ یہ 1923 کی بات ہے۔ یوں ہمارے مگسی صاحب کو 15 سال کی عمر میں پیروں بھرے شہر ملتان میں پٹخ دیا گیا۔ مگر آسمانوں کو کچھ اور منظور تھا۔ ایک تو یوسف کی یہ بھرپور عقلی نوجوانی کی عمر تھی۔۔۔ اور دوسرا یہ کہ ملتان، جھل مگسی نہ تھا۔

صرف یہی نہیں کہ جَھل، بلوچستان کے بیسویں صدی کا ایک معمولی گاؤں تھا، اور ملتان ایک جگمگاتا شہر۔ بلکہ یہ بڑا فرق بھی تھا کہ جَھل، گاؤں والے روایتی جمود و سکوت کی گُپھا تھا، اور ملتان حرکت و برکت سے دہل رہا تھا۔ جَھل، پیروی و تقلید کا بے پایاں دشت تھا اور ملتان میں مچلتے افکار تھے، دمکتے نظریات تھے۔ جَھل میں وابستگیاں ابھی محض خونی رشتوں کی تھیں، جبکہ ملتان میں وابستگیاں تجارتی، فکری اور سیاسی تھیں۔ جَھل جہاں ''خیر خیریت'' تھی مگر ملتان سیاسی سرگرمیوں میں بَل کھا رہا تھا۔ جَھل کے پاس سماجی تنظیم قبائلی تھی مگر ملتان میں سیاسی پارٹیاں وجود رکھتی تھیں۔ جَھل جہاں حالت پر صبر و شکر تھا مگر ملتان میں خدا کی سب سے بڑی نعمت یعنی آزادی، کے لیے تحریکیں چل رہی تھیں۔

ملتان نے اُس جلا وطن نوجوان پر ان اچھائیوں کے علاوہ ایک اور نیکی یہ کی کہ اُسے مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان اور اِس قبیل کے دیگر دانش وروں اور لیڈروں سے آشنا کر دیا۔ وہ بہر حال مقامی نہیں ایک عالمی نکتہ نظر رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ یہاں کئی رسالوں اور اخباروں کا مستقل خریدار تھا۔ یہیں پہ وہ اقبالؔ اور حالیؔ کے افکار سے خوب مستفید ہوا۔

افسانہ ''تکمیلِ انسانیت'' اُس وقت کا بھی تذکرہ کرتا ہے جب پناہ گزیں باپ 1927 میں اپنے خالق حقیقی سے ملنے بہاؤالدین ذکریا کے مزار کے پڑوس میں زمین دوز ہوا۔ یوں ذہنی بلوغت کے ذائقوں سے آشنا شدہ 20 سالہ یوسف، 5 برس تک ہندوستانی

سیاست دیکھا اور بھگت کر واپس جھل آ گیا تھا۔ جھل جہاں تاریکیوں کا لنگر ہنوز جاری وساری تھا۔

اس کا بڑا اور سوتیلا بھائی بڑے کروفر کے ساتھ مقامی رئیسوں ، ریاست کلات کے نمائندوں اور انگریز کمشنروں ڈپٹی کمشنروں کے جلوس میں تخت نشین ہوا۔ اُس نے جائیداد اور مال واسباب پر قبضہ کر لیا اور یوسف کو محض سوتیلے پن کی محرومی عطا کر دی۔

نوجوان یوسف ہر طرح سے ایک ناواقف ماحول میں آ گیا تھا۔ یہ محض دو علاقوں کے بیچ مہاجرت نہ تھی۔ یہ تو دو کلچروں کے بیچ سفر تھا۔ وہ ایک ایسے علاقے سے آیا تھا جہاں کاٹن کا فیوڈلزم بھی تھا اور کاٹن ہی کی نیم انڈسٹری بھی۔ وہ آیا ایسے علاقے میں تھا جہاں ابھی سرداروں نے سائیکل چلانے تک پہ پابندی لگا رکھی تھی۔

ملتان ہندوستان تھا اور جَھل بلوچستان تھا۔ اور وہ بھی قبائلی بلوچستان نہیں جہاں تھوڑی بہت عوامی حرکت موجود رہتی تھی۔ جَھل تو فیوڈل ریاستِ کلات کے معجونِ فلک سَیر کا باغیچہ تھا۔ دونوں خطوں میں فرق یہ تھا کہ ملتان سیدھا سادا مراج مگر صنعتی ملک برطانیہ کی غلامی میں تھا، مگر جَھل دیسی فرسودہ فیوڈلزم پہ قائم شخصی بادشاہ کے تحت۔ ایک جگہ سیدھا سیدھا انگریز کی مکمل غلامی تھی جبکہ جَھل میں انگریز خان کے ذریعے اپنا کام چلاتا تھا جو بہت کرخت اور فرسودہ ہوا کرتا تھا۔ انگریز نے ہمیں مقامی پست شاہی نظام کے تحت رکھا۔

یہ بات درست ہے کہ غلامی سے بڑھ کر انسانی تذلیل اور نہیں ہو سکتی ،اور آزادی سب سے بڑی نعمت ہے خواہ یہ نامکمل کیوں نہ ہو۔ مگر اس حقیقت کو بھی مدِ نظر رکھیے کہ ملتان نامی جو علاقہ مکمل غلامی میں تھا وہاں انگریزوں کی طرف سے عوامی جدوجہد کے نتیجے میں کچھ کچھ حقوق شہریوں کو میسر تھے۔ جبکہ جَھل جو نگریز سے تو نیم آزاد تھا۔ مگر فیوڈل بادشاہت کے سبب وہاں شہری حق حقوق نابلد تصورات تھے۔

یوسف عزیز کے جھل مگسی میں بھرپور نا خواندگی تھی ،غربت بیان سے باہر تھی۔ شراب و بھنگ اور جوئے میں غلطاں رعایا تھی۔ خانِ قلات نے کیلیں لگا ڈنڈا اپنی بیوروکریسی کے چیف ، وزیر اعظم شمس شاہ کو تھما دیا تھا۔ اور انگریز کی پشت پناہی رکھنے والا پانچ جماعت پاس یہ شمس شاہ عیش

وعشرت کی دلدادگی میں مکمل طور پر ایک سَیڈسٹ شخص تھا۔

اگر آپ اسی زمانے میں شائع شدہ کتابچہ ''شمس گردی'' کا مطالعہ کریں تو آپ کو یوسف اور کرد صاحب کی زبانی اُس زمانے کا اصل بلوچستان ملے گا۔ یہ کہ، بلوچستان میں کسانوں سے سڑکوں پر پانی چھڑکنے کا کام بیگار کے طور پر کرایا جاتا تھا۔ جب کبھی بڑا انگریز حاکم حدودِ ریاست میں مدعو کیا جاتا تھا تو اس کو خوش کرنے کے واسطے تزئین و آرائش کا جس قدر انتظام کیا جاتا تھا وہ تمام بیگار پر مفت کرایا جاتا۔

اسی طرح جس دن مدعوشدہ انگریز حاکم نے مقررہ مقام پر تشریف لانا ہوتا تو بیس، پچیس میل تک سڑکوں پر صبح سے شام تک بھوکا اور پیاسا رکھے گئے حفاظتی آدمی بہ لحاظ خوشامد کھڑے کیے جاتے جو تمام بیگاری ہوتے تھے۔ اکثر سرکاری عمارتوں کی تعمیر میں اجرتی مزدوروں کے دوش بدوش بیگاری کسانوں کو بھی بھوکا اور پیاسا رہ کر مفت اور بلا معاوضہ کام کرنا پڑتا تھا۔

جہاں تک سڑکیں بنی تھیں ان کو شروع میں بھی بیگار پر مفت تعمیر کرایا گیا تھا اور تب سے ہمیشہ کے لیے یہ عام دستور ہو گیا تھا کہ جب بھی ضرورت پڑتی، ان سڑکوں کی درستی اور مرمت ان کسانوں سے جبراً کروائی جاتی جن کے علاقے میں سے یہ سڑک گزرتی تھی۔

تمام ایسے کاریزات پر بھی مالیہ وصول ہوتا تھا جو منہدم ہو چکے تھے۔

ریاست کے اندر پانی اور زمین سے متعلق مقدمات میں کورٹ فیس وصول ہونے کے باوجود متنازع پیداوار کو میانجی خانہ میں رکھنے کے واسطے تین روپے فیصدی مزید معاوضہ لیا جاتا تھا حالانکہ اس قسم کی اجناس کو سرکاری تحویل میں رکھا بھی نہ جاتا تھا، بلکہ دوکاندار لوگوں کے پاس امانتاً رکھوا دیا جاتا اور ان کو بھی کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا۔

موسمِ خزاں میں باغات کی برگ ریزی پر محصول لیا جاتا تھا۔

کھڑی فصلوں، آلو، پیاز وغیرہ پر بھی '' محصول جمعداری'' کے نام سے ٹیکس لگا دیا گیا تھا۔

جن لوگوں کو سرکاری حراست میں لیا جاتا ان کو وہاں سرکاری خوراک نہیں دی جاتی تھی،

نہ انھیں مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالنے کی اجازت تھی۔ لوگ فی سبیل اللہ انھیں روٹی لا کر دیا کرتے تھے۔ اُس پر بھی قہر یہ کہ جہاں کہیں ضرورت پڑتی انہی قیدیوں کو بیگار پر لگا دیا جاتا تھا۔

کاشتکاروں کی فصلات کٹ چکنے اور صاف ہونے کے بعد بھی چھ چھ سات ماہ تک ان کی بٹائی نہ ہوتی۔ اور باہر پڑا ہوا کاشتکار کا غلہ بارش سے بھیگ اور سیلاب میں بہہ کر ضائع ہو جاتا تھا۔ یہ بھی ہوتا تھا کہ نئی کاشت کا وقت سر پر آن پہنچتا مگر کاشتکار کے پاس بٹائی نہ ہونے کے باعث تخم ریزی کے لیے غلہ نہیں ہوتا۔ اور وہ مہاجن کو گراں قدر سود دے کر قرض پر تخم لے کر کام چلانے پر مجبور تھے۔

عدالتوں میں رشوت ستانی کا دور دورہ تھا۔ معمولی محرر بھی جب تک روپیہ، آٹھ آنہ غریب اہل مقدمات سے نہ لیتے، ان سے سیدھے منہ بات نہ کرتے تھے۔ معمولی معمولی مقدمات (جو زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کے اندر فیصلہ پا سکتے تھے) وہ ابتدائی دریافت میں ہی سالہا سال تک معلق رہتے تھے۔ ہر مسل کا وزیر اعظم کے پاس جانا ضروری ہوتا۔ اور بے پناہ اختیارات اپنے ہاتھ میں مرکوز رکھنے والے اس وزیر اعظم کی عمر ستر سال تھی۔

پھر اِس سب پر طرّہ یہ کہ کوئی لکھے قوانین موجود نہ تھے۔

بلاشبہ ملتان متحارب نظریات کا کوئی میدانِ جنگ نہ تھا۔ اور نہ وہاں ڈارون و مارکس کے نظریات روشن تھے۔ مگر وہاں موجود خلافت و کانگریس، اور پان اسلام ازم کے نظریات ایک ایسے جَھل کے لیے تو ہلاکت خیز تھے جہاں لوگ تبدیلی سے نہ واقف تھے نہ آرزومند۔ یوسف بجا طور پر قبائلیت کے کاہنوں اور فریسیوں کی جڑیں کھودنے والا یسوع تھا۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ یوسف عزیز، برونو اور شاہ عنایت کیوں نہ بنا۔ نہ گل محمد کے ہاتھوں اور نہ شمس شاہ کے ہاتھوں، اور نہ اُس زمانے کے شہوانڑیں، بنگلزئی اور رئیسانڑیں سرداروں کے ہاتھوں۔

بے قرار یوسف نے قلات کی متشدد، حریص اور ظالم حکمرانی کے خلاف 17 نومبر 1929 میں لاہور کے اخبار مساوات میں ''فریادِ بلوچستان'' نامی مضمون لکھا۔

یہ گویا پہلا بڑا پتھر تھا، جو صدیوں سے چیلنج نہ کردہ بادشاہت کے شیش محل میں لگ چکا تھا۔

حالاں کہ اخبار لاہور میں تھا اور بلوچستان میں اخبارات کا داخلہ ممنوع تھا۔ اس لیے اس مضمون سے کوئی خاص اثر نہیں پڑنا تھا۔ مگر اس سب کے باوجود نازک مزاجِ شاہاں کے ابرو پہ ہمالیائی شکنیں پڑ گئیں۔۔۔ لکھا حرف بادشاہت کی جڑوں میں دیمک!!۔

یہی مضمون یوسف کا جرم بنا اور جرم کی سزا جیل و جرمانہ تھی، ایک سال جیل۔ سال تھا، 1930۔

افسانے میں اُس جیل میں وہ ذکر اذکار اور غور و فکر کا تذکرہ کرتا ہے۔ اور وہیں ایسا غیر متوقع موڑ کاٹتا ہے کہ حیرانی ہوتی ہے۔

اس لیے کہ وہاں غور و فکر کے بیچ اُس پر ریویلیشن والہام ہوتا ہے۔ وہ افسانے میں شمس شاہ کے بے دخل ہونے اور یوسف کو جھل مگسی کی سرداری ملنے تک کی اپنی ساری جدوجہد کو بیان نہیں کرتا بلکہ اتنی بڑی فتح کو اسی ریویلیشن کا مرہونِ منت قرار دیتا ہے۔

یہ افسانہ حالاں کہ آٹو بائیوگرافک ہے اور یہ اس کی موت سے محض ایک برس قبل مارچ 1934 میں شائع ہوا تھا مگر وہ اس میں 1934 تک نہیں بلکہ 1930 تک کے واقعات لکھتا ہے۔ افسانے میں جیل سے رہا ہونے، انجمن اتحادِ بلوچستان میں شامل ہونے، آل انڈیا بلوچ کانفرنس جیکب آباد و حیدر آباد کے انعقاد اور شمس گردی و محراب گردی کی اشاعت کا کوئی تذکرہ موجود نہیں ہے۔ نہ اس میں مگسی ایجی ٹیشن کا ذکر ہے۔ کیا قصداً ایسا ہے؟۔ لیکن اگر اس نے قصداً ایسا کیا بھی تو بھی 1934 میں وہ جس فکری اور شعوری سطح پر پہنچ چکا تھا، اُس کا شائبہ ہم ضرور دیکھ لیتے۔ اس لیے کہ 1934 میں اُس کے افکار میں نیشنلزم اور سوشلزم بھی ''اچھا بھلا'' جگہ پا چکے تھے۔ اور وہ جدوجہد میں سیکڑوں باوفا و باوقار ساتھی پا چکا تھا۔ اس ساری جدوجہد اور ہلچل کا اجمالی سا تذکرہ تک اس نے نہیں کیا۔ معلوم نہیں کیوں؟!

بلوچستان میں افسانے کا کھوج لگانے والوں کے لیے یہ بہت دلچسپ بات ہوگی کہ مئی 1934 میں ''بلوچستان جدید'' کراچی (یکم مئی 1934، 8 مئی، اور 24 مئی 1934) کے اندر

چار قسطوں میں یوسف عزیز کا افسانہ چھپا تھا؛ ''تکمیل انسانیت''۔ جسے 2017 میں اب یوسف عزیز مگسی چیئر یونیورسٹی آف بلوچستان نے ایک الگ کتابچہ کی صورت شائع کیا ہے۔

بقول انعام الحق کوثر کے؛'' یہ افسانہ نہ صرف یوسف عزیز کی ذاتی زندگی کے مدوجزر کا مظہر ہے اور اس کے سماجی شعور پر دال ہے بلکہ بلوچستان کو جس اتحاد و اشتراک کی ضرورت تھی۔ اس کی بھی روح مجسم ہے، یہ مقصدیت ان کی زبان و پیرایہ بیان کے ساتھ مل کر اسے اردو زبان کے موجودہ افسانوں میں سے ایک عظیم افسانہ بنا دیتی ہے''۔(5)

''تکمیلِ انسانیت'' نامی یہ افسانہ ایک لحاظ سے اس کی ذاتی زندگی کے اتار چڑھاؤ کا مظہر ہے۔ آپ سمجھیے کہ بچپن سے لے کر 30-1929 تک کی اس کی اپنی زندگی کی سرگزشت ہے۔ گو کہ اُس کی شاندار سیاست متشکل و مربوط انداز میں افسانہ سے اگلے پانچ برس میں جوان ہوئی مگر افسانے میں مذکور اس کی زندگی کے ابتدائی اکیس برس تو اس کی سیاست کے اینٹ گارے کی یکجائی کے سال تھے۔

اس افسانے میں عزیز احمد ایک نواب کا بیٹا ہے۔ بڑے بھائی نے نواب کی وفات کے بعد عزیز احمد سے جائیداد کے معاملے میں انصاف نہ کیا مگر عزیز احمد نے یہ غیر منصفانہ تقسیم مان لی۔ اچھے اخلاق والا عزیز احمد لوگوں میں مقبول تھا۔ بہت مطالعہ رکھتا تھا۔ اس نے انگریز استعمار کے خلاف ایک پُر جوش مضمون لکھا جس پہ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ پیچھے بڑے بھائی نے ساری جاگیر تاحکم ثانی کورٹ آف وارڈ میں داخل کروادی۔ اس نے ایک سال تک جیل کی صعوبتیں جھیلیں۔

اس کی رنگین زبان، مقصدیت اور افسانویت سب مل کر یوسف کو ایک عظیم افسانہ نگار بناتے ہیں۔

افسانے میں شعروں کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے۔ اسلامی تعلیمات اس افسانے میں بھرپور طور پر استعمال ہوئے ہیں ۔ یہ افسانہ اخلاقی ، راست بازی اور حق پسندی کے ساتھ ساتھ عفو و درگزری کے جذبات سے رچا ہوا ہے۔

محققین کو اس کا لکھا ہوا صرف یہی ایک افسانہ دستیاب ہو سکا ہے۔ ہم نے اُس کی اپنی

تحریروں میں بھی اور نیز اُس کے ہم عصروں اور بعد کے فالوئرز کی تحریروں میں بھی اس ایک کے علاوہ کسی اور افسانے کا تذکرہ نہیں پڑھا۔

پ۔ شاعری

یوسف عزیز مگسی کو بہ یک وقت بلوچی، فارسی، عربی، انگلش، سندھی، سرائیکی اور اردو زبانوں پہ عبور حاصل تھا۔(6)

مگسی صاحب ایک جہاں گشت انسان تھا۔ اُس کے اندر ایک نہ بجھنے والی تڑپ موجود تھی۔ وہ اپنے ہم وطنوں کی پستی پسماندگی پہ بہت کڑھتا تھا۔ اسے شہری حقوق کے حصول کی بیماری لاحق تھی۔ وہ اپنے وطن کو آزاد کرانا چاہتا تھا۔

اس کے دل و دماغ میں خیالات کا ایک انبار موجود تھا۔ اور وہ اِن خیالات کو نوجوان نسل کے اذہان میں انڈیلنے کو بے قرار تھا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس نوجوان و مالدار بلوچ جاگیردار (نہری جاگیردار) کو قرآن و حدیث کی ایک بہت بڑی تعداد زبانی یاد تھی۔ چنانچہ اس کی اردو اور فارسی شاعری میں قرآنی آیات، احادیث، تلمیحات، استعارات، اور تشبیہات کمال مہارت سے استعمال کیے گئے۔ وہ دلیل

کے بطور، یا اپنی بات پر وزن دینے کی خاطر، اور یا پھر اپنی نثر کو تو نگر و توانا بنانے کی خاطر بہ وقتِ ضرورت انھیں استعمال بھی کرتا تھا۔ یہی کام وہ شاعری میں بھی کرتا تھا۔ برصغیر کہوں تو شاید کوئی مثال مل جائے مگر بلوچستان میں یہ اولین طرزِ تحریر تھی۔ اُس کے بعد کے سو سالوں میں بھی اُس کا ہم پلہ تو کیا، اس معاملے میں اس کا کوئی مقلد بھی سامنے نہ آیا۔

ہماری دسترس میں کوئی ایسی دستاویز یا تذکرہ موجود نہیں ہے جس سے پتہ چل سکے کہ یوسف عزیز نے شاعری کب شروع کی تھی۔ اس کی باقاعدہ شاعری شاید 1926 کی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر انوار احمد نے ملتان سے ایک کتاب مہیا کی: دبستانِ ملتان۔ یہ کتاب دراصل 195 قلمکاروں کا وفات نامہ ہے۔ اس میں لکھا ہے: ''1926 میں ملتان میں پہلی مرتبہ ٹکٹ لگا کر مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں حفیظ جالندھری بھی آئے۔ اس مشاعرے کا تمام خرچ نواب یوسف علی مگسی نے برداشت کیا۔''(7)

لورالائی کے بزرگ لکھاری خورشید افروز نے بھی اسی زمانے سے متعلق دو فقرے لکھے:

''1927 میں کوئٹہ میں ''بزمِ ادب'' قائم ہوئی۔ اس بزم کے زیر اہتمام ماہانہ مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ جن میں عبدالحق زبور، یوسف علی خان عزیز مگسی، محمد حسن نظامی، محمد حسین عنقا، نسیم تلوی اور اسلم اچکزئی وغیرہ شرکت کرتے تھے''۔(8)

اگلی دلچسپ تحقیق اس بات پہ ہونی چاہیے کہ مگسی صاحب نے کون کون سی زبان میں شاعری کی۔ اردو اور فارسی کا تو ہمیں معلوم ہے۔ مگر بلوچی براہوئی تو اُس کی مادری قومی زبانیں تھیں۔ یقیناً اِن زبانوں میں بھی شاعری کی ہوگی۔ جو شخص اردو، فارسی، اور سندھی میں شاعری کرے وہ اپنی مادری قومی زبان میں کیسے شعر نہیں کہے گا؟ لیکن ابھی تک ہمیں اس کا کوئی بلوچی شعر نہ ملا، اور نہ ایسا کوئی حوالہ ہمیں میسر آ سکا۔

اسی طرح خان عبدالصمد اچکزئی اس کی سندھی شاعری کا ذکر کرتا ہے: ''نواب زادہ یوسف علی خان بہت اچھا دانش ور تھا۔ سندھی، اردو اور فارسی کا بلند پایہ شاعر، لکھاری اور مقرر تھا۔(9)

صمد خان جیسا اُس کا قریبی دوست غلط ہو ہی نہیں سکتا، لہٰذا اس کی گم شدہ سندھی شاعری کا کھوج لگانا ریسرچرز پہ سماجی قرض ہے۔

مگسی صاحب کی شاعری عام طور پر برصغیر کے مسلمانوں اور خاص کر بلوچستان کے پڑھے لکھے عوام کے لیے تھی۔ اس کی شاعری میں اس کی محبوبہ، آزادی تھی اور اس کا مخاطب بلوچستان کے عوام تھے۔ اس کی زندگی کا نصب العین بلوچستان میں انقلاب، آزادی اور اسلامی مساوات تھا۔ اس کی شاعری قوم کو بیدار کرنے کے لیے تھی۔

ایک فقرے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مگسی صاحب کی شاعری سیاسی اور سماجی ہے۔

غزل کی بہ نسبت نظم پہ اس کی ترجیح نظر آتی ہے۔ اس کی نظمیں غزلوں سے بہت زیادہ ہیں۔ کچھ نظمیں طویل ہیں اور کچھ مختصر۔ جذبات سے بھری نظمیں۔ ترانہ نما نظمیں۔ تحریک کی ترجمان نظمیں۔ اسے شاعری پہ مکمل گرفت تھی۔

قومی نظم

(دسمبر 1932 جیکب آباد کانفرنس کے موقع پر لکھی گئی)

خزاں رسیدہ ہے مدت سے گلستانِ بلوچ
نوائے بلبلِ نالاں ہے نوحہ خوانِ بلوچ

نگاہِ اوج میں پستی کا مٹ چکا احساس
زمین بھی نظر آتی ہے آسمانِ بلوچ

جمود ایسا کہ آثارِ زندگی مفقود
جہاں سے ہے نرالا مگر جہانِ بلوچ

تمہاری چاہ میں یوسف نے سختیاں جھیلیں
تجھے خبر بھی ہے گم کردہ رہ جوانِ بلوچ

قریب تر نظر آتی ہے منزلِ مقصود
علی نواز ہے جب میرِ کاروانِ بلوچ

خدا کے واسطے اے قوم ہوش میں آ جا
دکھا دے دنیا کو کیسی ہے آن بانِ بلوچ

بقول انعام الحق کوثر، ''اس کانفرنس کے آخری اجلاس میں یوسف عزیز مگسی کی یہ نظم پڑھی گئی۔'' (اور بقول انعام الحق کوثر، بلبلانِ خلافت نے یہ قومی ترانہ پڑھا تھا)۔

میں اگر چاہوں تو ذرے کو بیاباں کر دوں
قطرۂ آب میں پیدا سرِ طوفاں کر دوں
یہ ارادہ ہے کہ اسلام کا خادم بن کر
ساری دنیا کو نئے سرے سے مسلماں کر دوں
پھر وہی بھولا سبق یاد دلاؤں سب کو
ہر بلوچی کو غرض عاملِ قرآں کر دوں
جی میں آتا ہے کہ پھر طور کو آباد کروں
آتشِ دل سے پہاڑوں میں چراغاں کر دوں
گاندھی و مالوی کے وعظ دھرے رہ جائیں
میں اگر قولِ محمدؐ کو نمایاں کر دوں

جوش میں آ کے اگر نعرۂ اللہ ماروں
حق و باطل کے تفاوت کو نمایاں کر دوں
میں وہ مجنوں ہوں اگر چاہوں جہاں کو یکسر
طرۂ یار کی مانند پریشاں کردوں
اس قدر شعلہ فشاں بزمِ جہاں میں ہو جاؤں
ذرے ذرے میں بپا حشر کا ساماں کر دوں
میں وہ مالی ہوں، اگر کھول دوں دل کی سوتیں
خشک صحراؤں میں پیدا گل و ریحاں کر دوں
اسی ایقانِ براہیم کا وارث ہوں عزیزؔ
اب بھی آتش کو اگر چاہوں گلستاں کر دوں

سہ روزہ ''ینگ بلوچستان'' کراچی نے 20 اکتوبر 1934 کی اشاعت میں مگسی صاحب کی ایک نظم ''جامعہ عزیزیہ جھل کے طلبہ سے'' کے عنوان سے چھاپی:

شعاعِ علم سے روشن کرو تم اپنے سینے کو
تمھیں ہے ڈھونڈنا اِک گمشدہ قومی خزینے کو
عزیزی جامعہ ہے درحقیقت دولتِ نایاب
کچھ اس کے سامنے سمجھو نہ قاروں کے خزینے کو
وہ انمول صفت ہے یہ اسے اچھی طرح سیکھو
بنانا ہے تمھیں گوہر، بلوچوں کے پسینے کو
کرو صد جانفشانی سے سبق اسلام کے ازبر
اسی توشے کو لے کر چل سکو گے تم مدینے کو
چھپا کب تک رہے گا آہ! جَھل کے تنگ گوشے میں

سرِ بازار لاؤ حسنِ ''یوسف'' کے خزینے کو

پیغامِ عمل

ہوئی حق کی خلافت تم کو عطا، مایوس نہ ہو، اٹھ ہمت کر
پھر نعرۂ باطن سوز سے تُو دنیا کو جگا، اٹھ ہمت کر

وہ زیبِ عرب، وہ فخرِ عجم روتا ہے تمہاری غفلت پر
اٹھ تھام لے باگیں دنیا کی ، غازی کہلا، اٹھ ہمت کر

ایک ہاتھ میں نیزہ ایوبی، اک ہاتھ میں سیفِ خالد ہو
مشرق بھی ترا، مغرب بھی ترا، اللہ کے لیے اٹھ ہمت کر

آلاتِ حرب کے فقداں سے اور سیم وزر کے کتماں سے
مایوس نہ ہو، اللہ پہ رکھ، اللہ کو پکار، اٹھ ہمت کر

ہے وقت عجب امت پہ پڑا، تاخیر کے معنی موت کے ہیں
تاخیر نہ کر، تعجیل سے اٹھ ، ایمان سے اٹھ، اٹھ ہمت کر

تجھے سیم وزر سے واسطہ کیا، اور توپ مشینوں سے کیا کام
تکبیر سے اٹھ تبلیغ سے اٹھ، شمشیر سے اٹھ ، اٹھ ہمت کر

معمور گناہوں کی دنیا کسی مردِ خدا کی تاک میں ہے
اے ارضِ خدا کی قوت اٹھ ، دنیا کو سنوار ، اٹھ ہمت کر

اس عالمِ رنگ و بو میں اگر آئی ہے خزاں تو خیال نہ کر
کر اور نیا تعمیر جہاں، معمارِ جہاں، اٹھ ہمت کر

بدیوں کے سلاسل کی کڑیاں اندر سے تو یہ سب کھوکھلے ہیں
بس ایک ضرب تکبیر کی پھر اے سیفِ خدا ، اٹھ ہمت کر

فاروقی سطوت لے کر اُٹھ، اور خالد کی پھر سیف بھی تھام
اے نائبِ حق فتنے کو مٹا، فتنہ ہے برا، اُٹھ ہمت کر

تقدیر کا رونا یہ کب تک ، تقدیر تمہاری خادم ہے
تو اپنے لیے اک اور نئی تقدیر بنا، اُٹھ ہمت کر

تو مورث ابراہیم کا ہے ، پھر آذر کی تقلید ہے کیوں
بت توڑ، خدا سے جوڑ کہ تو ہے عبدِ خدا ، اُٹھ ہمت کر

تو فرزند توحید ہے گر، توحید پہ کٹ ، توحید پہ مر
سرمایہ ترا، سامان ترا، ہے ذاتِ خدا، اُٹھ ہمت کر

اعلون ہے تو، پرشرط ہے یہ، ایماں کی شعاعیں پیدا کر
اور دل کو امنگوں سے گرما، اے حزب خدا، اٹھ ہمت کر

یکم مارچ 1934 کو شاعر یوسف یوں کہہ رہا تھا:

اے مطربِ دل نواز!

ہاں گائے جا، ہاں گائے جا
تانوں سے جی بھرمائے جا
اہلِ بلوچستاں کو پھر
شرمائے جا شرمائے جا
اے مطربِ نغمہ نواز

سُن او غلامی کیا ہے تُو
اک پیکرِ لعنت ہے تُو
جس قوم پہ نازل ہے تُو
اُس قوم پہ ذلت ہے تُو
اے مطربِ نغمہ نواز

اے انقلابِ دہر جاگ
پھر کھول دے بوتل کے کاگ
امرا تو کھائیں مرغیاں

مزدور کھائیں دال ساگ
اے مطربِ نغمہ نواز

اے گردشِ ایام تُو
قسمت کی باگیں موڑ دے
جو رہنما غدار ہو
تُو اس کی گردن توڑ دے
اے مطربِ نغمہ نواز

یہ نغمہ ہائے حریت
سُن او بلوچی قوم سُن
اٹھ اور آنکھیں کھول دے
اے مست سکّہ و قوم سُن
اے مطربِ نغمہ نواز

اس کو مٹا جلدی مٹا
سردار ہو انگریز ہو
جو قوتِ شیطان ہو
جو ثانیِ چنگیز ہو
اے مطربِ نغمہ نواز

اسی سے ملتے جلتے خیالات کا عکس اُس کی ایک اور شاعری میں بھی دیکھئے:

ضرورت ہے کہ پھر شمعِ وطن پر نذر ہونے کو

وطن زادوں سے ہر آتش بجاں پروانہ ہو جائے
فقط دانائیوں ہی سے مرادیں بر نہیں آتیں
ضرورت ہے کہ داناؤں میں اک دیوانہ ہو جائے
ضرورت ہے اک ایسے کاسہِ سر شعلہ دیدہ کی
شرابِ آتشِ الفت کا جو پیمانہ ہو جائے

عافیت کوش احباب سے

کرم ہے تیغِ جفا کا بقدرِ وسعتِ شوق
جسے ہو ذوقِ تماشا کفن بدوش آئے
بنے گا کام نہ یہاں اب قراردادوں کا
وہ سربلند ہے جو بن کے سرخ پوش آئے
نوائے گاندھی و جیکر سے کام بن نہ سکا
کمال سا کوئی اب سازِ پُرخروش آئے
اب آگے مرحلہ آتا ہے سخت کوشی کا
ہمارے ساتھ نہ اب کوئی عیش کوش آئے
نہ ہو سکے جو حریفِ خمارِ جام تو کیا
مزہ تو جب ہے کہ پینے سے اور ہوش آئے
جناب شیخ کو چلتے ہی بن پڑی آخر
کچھ ایسی شان سے محفل میں بادہ نوش آئے
اٹھ اے بلوچ بدل دے نظامِ فطرت کو
جگر پہ تیر چلیں اور دل میں جوش آئے

20 فروری 1934

یوں بحوالہ اخبار بلوچستان جدید ''نواب یوسف عزیز مگسی 27 مارچ 1934 کو بمبئی سے بغرض علاج یورپ روانہ ہو چکے ہیں'' (بلوچستان جدید۔ 8 اپریل 1934۔ صفحہ 7)۔ راستے ہی میں مشن اور کاز کا مالک یوسف علی یوں دھاڑتا، ڈکراتا ہے؛

قسم اُس جوش کی حصے میں آیا جو نبوت کے
قسم اُس درد کی پہلو میں آیا جو محبت کے
قسم اُس تیغ کی لرزش سے جس کی آسماں لرزے
قسم اُس آنکھ کی سرگوشیِ دل کو جو بھانپے ہے
قسم ہے اُن نیازوں کی جو نازِ عشق بن جائیں
قسم ہے اُن نمازوں کی جو نازِ عشق بن جائیں
قسم ہے اُس جنوں کی جو نصیبِ مست دانا تھا
قسم ہے اُن لبوں کی جن پہ الفت کا ترانا تھا
قسم اُس بادہ تیگانہ سازِ کلفتِ دنیا
قسم اُس سوزشِ بے ہوش سازِ الفتِ دنیا
قسم رسوائیوں کی جو کہ آغازِ محبت ہیں
قسم بربادیوں کی جو کہ انجامِ محبت ہیں
قسم ہے غزوہِ بدر و اُحد میں مرنے والوں کی
قسم ہے کربلا میں پیاس سے جاں دینے والوں کی
قسم اُس نا خدا کی جو ندیمِ جوشِ طوفاں ہو
قسم اُس بادباں کی جو رفیقِ باد و باراں ہو
قسم اُس برق کی جو مشعلِ شب ہائے نعمت ہو

قسم بادل کی جس کو فصلِ دہقاں سے محبت ہو
قسم چنگھاڑ کی جو مست شیروں سے نکلتی ہو
قسم تلوار کی جو خونِ اعدا سے بہلتی ہو
قسم بندوق کے ہیبت فزا صوتِ دھنا دھن کی
قسم ہے قوم کے جوشِ زنا زن کی
قسم اُس مرد کی جو سر کٹا نے پر بھی راضی تھا
جو وقتِ ذبح بھی خندہ زناں تھا اور نمازی تھا
قسم ہے امیِ بطحا کے ایثار و صداقت کی
شکم پر سخت پتھر باندھنے والی سخاوت کی
قسم ہے کرد اور عبدالصمد خاں کی صداقت کی
قسم اہلِ بلوچستان کے خونِ شجاعت کی
قسم ہے مادرِ ہندوستان کے رام کرشن کی
قسم ہے اس کے گاندھی اور جواہر لال نہرو کی

کہ اپنے ملک سے داغِ غلامی دھوکے چھوڑوں گا
بلوچستاں کو آزادی کی مئے پلوا کے چھوڑوں گا
پکڑوا کر تمھارے ہاتھ میں چپو صداقت کا
تری ساحل نشیں کشتی کو یم میں لا کے چھوڑوں گا
وطن کی تار راتوں کو چراغستاں بنانے میں
میں اپنے عرقِ خوں سے شمعِ دل جلوا کے چھوڑوں گا
جلا کر استخواں کے مغز سے شمعِ دلِ مضطر
عزیزانِ وطن کی بزم کو چمکا کے چھوڑوں گا
کٹا کر چند سر اور گردنیں اپنے رفیقوں کی

زکوٰۃِ فرض اپنی قوم سے دلوا کے چھوڑوں گا
میں پھر اندازِ نو سے نغمۂ حبِ وطن گا کر
سکوت اندوہِ تار قوم کو بجوا کے چھوڑوں گا
میں پھر افسانۂ دار و رسن کے شعر گا گا کر
کئی مہ پتر اپنے ملک کو دلوا کے چھوڑوں گا
سبق دے کر اخوت کا ،شجاعت کا، محبت کا
میں پھر بگڑی بلوچستان کی بنوا کے چھوڑوں گا

میں پھر اعلان کرتا ہوں میں پھر اقرار کرتا ہوں
میں اپنی بات پر پھر یوسفی اصرار کرتا ہوں

بلوچستانیو! جس وقت تم مجھ کو پکارو گے
مُجھے سر باز پاؤ گے، مجھے جانباز پاؤ گے

(قاھرہ 3اپریل1934)

***

کہاں ہے قوتِ حق اور کہاں مروتِ خلق
سناکے تھک گئے ہم تو یہ حالِ زار اپنا
عزیزؔ موت کا جب ایک دن معین ہے
مجاہدوں میں کرائیں نہ کیوں شمار اپنا

***

زجوان خام سوزے سخنم تمام سوزے
غزلے کہ می سر ایم ، بتو ساز گار بادا

حاصلِ عمر نثار رہِ یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

(25مارچ1934)

ذرا اُس کے فارسی کلام کا ایک ٹکڑا دیکھئے جو اُس نے اپنے کتابچہ ''شمس گردی'' میں چھاپا تھا۔

ما الفتِ ترا بدل و جاں خریدہ ایم
از دو جہان مہرِ تو در دل گزیدہ ایم

باما بگو زِ آتشِ نمرود اے رفیق
ما از شرابِ عشقِ خلیلی چشیدہ ایم

باطل کجا کہ وحدتِ حق را دہد شکست
درکربلا شہادتِ توحید دیدہ ایم

گنجد کجا بہ نظرم این لشکرِ یزید
در کربلا شہادتِ شبیر دیدہ ایم

نازم و شکر گویم این قید و بند را

زیں بر مقامِ عشق حسینی رسیدہ ایم

***

مستیِ مانہ زِصہبا ست نہ جام است ایں جا
بے خبر بادہ وپیمانہ کُدام است ایں جا
غم نداریم زتاریکیِ شبہائے فراق
داغِ حسرت صفتِ ماہ تمام است ایں جا
پرکاہیم ونداریم زطوفان باکے
میل غم نیست اگر تند حرام است ایں جا
سفر عِشق نہ منزل نہ مقامے دارد
رفعت ِعرش درایں راہ دوگام است ایں جا
ابرِ غم مطلع مارانہ گرفت است چناں
کہ بدانیم اگر صبح کہ شام است ایں جا
ساقیِ من کہ مرادادہ دوچشمِ پرنم
کرد اِشارت کہ نصیب ِتو دو جام اُست ایں جا
ہر کُجامِ نگرم جلوہ نما افرنگ است
مصر وایران وعراق این ہمہ نام است ایں جا
از سر افگندگیِ خویش نداریم غمے
گُفت یوسُف پئے ہر سجدہ قیام است ایں جا

ما اُلفتت ترا بل و جان خریده ایم
از ور جہان مہر تو درِ دل گریده ایم
باما مگوز آتشِ نمرود ای رفیق
ما از شرابِ عشق خلیل چشیده ایم
باطل کُجا کہ وحدتِ حق راهدشکست
در کربلا شہادت توحید ویده ایم
گنجد کجا بہ نظرم این لشکرِ یزید
درِ کربلا شہادت شبیر ویده ایم
نازم و شکر گویم این قید و بند را
زین هرمقام عشق حسین رسید ایم

اپنے دوستوں کے قید ہونے پر کہا تھا کہ ہم کیسے خاموش بیٹھ سکتے ہیں:

امروز کہ یاران ہمہ رسوا سر بازار
حیف است اگر جامہ ناموش بپوشم

عزیؔز کی آرزو ملاحظہ ہو؛

داری کہ زیبؔ گرون منصور گشتہ است
اوکم نظر بیا!! کہ ہمان دارم آرزوست
خاری کہ درخلید بپائی جناب قیس
بگذار ای رفیق ہماں خارم آرزوست

زیں ہمرہانِ کاذب وبُزدِل دلم بکوفت
صدیقم و صداقتِ بوبکرم آرزوست
از شیطنی بوز نہ یارب دِلم بسوخت
رخصت بدہ کہ نعرہ فاروقم آرزوست
تہذیب نو کہ دربغلش بے مروتی است
بگزار گو مروّتِ عثمانم آرزو سُت
از بہر خیربی کہ بہ بازوئے ھندیان
نشکست باز بازوی، کرارم آرزوست
باز از برائے زندگی دین حق رفیق!
یک خالد و خلیل و شبیرم آرزوسُت
برعصمت و صداقت من یوسفی گواہ
حقا کہ یوسف ہستم و زندانم آرزوست

یوسف کی شاعری میں ایک خوبصورت ڈرامائی انداز ملتا ہے۔ایک بار سردار لوگ مل کر اے جی جی کے پاس گئے اور اُس سے یوسف عزیز کی شکایت کی۔سردار لوگ یوسف عزیز کے خلاف باجماعت خانِ کلات کے پاس بھی پہنچے تھے۔اس قصے کو مگسی صاحب نے بہت ہی مؤثر انداز میں قلم بند کیا تھا۔ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی محنت کے طفیل ہم وہ کلام آپ تک پہنچا پا رہے ہیں:

نوحہِ سردارانِ سراوان

خانِ ما اے وارثِ تختِ قلات
خیز شد ناموسِ ما از کائنات
سینہِ ما کرد یوسف داغ داغ
ازدمِ او ملک راشُد گُل چراغ
از شکستِ شمس آمد در وجود
نوجواناں را زِدستِ مار بود
کافر و اندر کلامش کافری ست
در شعارِ زندگانی سامری ست
دل بہ مزدوراں بہ بست ازما گسست
شانِ سرداری زِ طرزِ او شکست
ہمسرِ خود گُرد را کردن خطاست
ہر کہ ازما نیست شان اورا کجاست
زہرہا اندر اصولِ اشتراک
نیست نفعے از حصولِ اشتراک
فخرِ قوم ایں کہ بپائے مافتد
می زند ایں رسم را یوسف لکد
شانِ مسجودیِ ما نابودشد
نوجواناں راخدا معبود شد
قدرِما کردہ برابر با غلام

میخورد با خانہ زادِ خود طعام
خواجگان بابندگان آمیختند
آبروئے دود مانے ریختند
قدرِ سرداریِ ما نہ شناختہ
بابرہنہ پائگاں درساختہ
ایں مساوات ایں اخوت جاہلی ست
شانِ ما افضل شمردن عاقلی ست
گشتہ باماؤبہ کیشِ ما عدو
ایں عدوئے ما نہ سازد ہم بہ تُو
اے کہ خانِ ما تو مارا منصفی
بشکن افسونِ نوائے یوسفی
قائم ست ایں شانِ تو از شانِ مِا
خیز و گرش انتقام اے خانِ ما
کُن ازیں منصب تومنصف یوسف را بدر
کُن گروہِ خوفناکش منتشر
حضرت کیٹن حکومت را چراغ
ملکِ مارا کُن ز بے کیشاں فراغ
نوجوانے کورذوقے بے بصر
از ہمائے سایہِ تو بے خبر
ایں کہ سرداریِ مارا زد بچاہ
میکند روزے شماراہم تباہ
در نگاہش بندہ و آقا یک ست

خوں بہائے شاہد و رُستا یک ست
ترس زیں طرزِ خطرناکش بہ ترس
آورد از لینن اندر ملکِ روس
ایں مساواتی گروہ قہرست قہر
بہرِ اقوامِ بلوچستان زہر
ایں فساد و ایں شرارت تابکے
ویں خموشی اے حکومت تابکے
ہان کجایند آں بروس وآن ڈیو
کہ بگویند از وفائے مابہ تو
از شما کردیم خدمت اے جناب
ازہمیں ارزاں شدہ برما خطاب
سیم وزر دادیم در جنگِ عظیم
حملہ ہا کردیم برکعبہ کریم
از مسلماناں گسستیم اے جناب
باتو دربستیم اے والا نصاب
ترک و بغداد و عرب را درزدیم
گو بما ہر اہلِ مذہب گفت ''شیم''
سرزِ خود کردیم و از تو آستان
دست ہا شستیم از حور و جنان
از برایت دین و ایمان باختیم
از ہمہ بگسستہ ماتو ساختیم
حالیا گشتیم محصورِ غنیم

اے عناں دارِ شہنشاہِ عظیم
وقت الحال آمدہ برما برس
المدد اے دادرس اے داد رس
یوسف و رفقائے او را قید کن
زود ترصیاد مارا صید کن

جی ہاں، یوسف تو ایسا ہی تھا۔ اس کا دل سرداروں کے گروہ سے متنفر ہو چکا تھا، اور مزدوروں کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ اُس کا طرزِ حیات اور بودوباش سردارانہ، نہ تھا۔ اس نے سجدہ و مسجودی کو فرش وزمین کے طاقتوروں شاہوں سے جلاوطن کرڈالا۔ اب سجدہ صرف عرش والے کے لیے مخصوص تھا۔ حتیٰ کہ خود اس کو راہنما ماننے والے نوجوان بھی اُسے راہنما اور لیڈر ہی مانتے تھے، کوئی ولایت کرامت کے خواب نہیں دیکھتے تھے۔ یوسف نے غریبوں، ضعیفوں کی قدر بالا کردی۔ اس نے چاکر وغلام کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کو وطیرہ بنالیا۔

یہ سارے اوصاف موجود ومضبوط سرداری نظام کو چھید کیے جاتے تھے۔ سرداروں نے خانِ قلات سے یوسف کی اس فساد وشرارت وسازش کی شکایت کی، حکومت کی خموشی کو کوسا۔ خان سے نوائے یوسفی کا خاتمہ کرنے کی التجا کی۔ یوسف کو سرداری سے ڈسمس کرنے اور اس کے خوفناک گروہ کو منتشر کرنے کی گزارش کردی۔

ت۔ خطوط نویسی

شاعری، مضامین، اخباری بیانات اور افسانہ کے علاوہ اس نے اپنے عوام دوست اور آزادی پسند نکتۂ نظر کو پھیلانے کے لیے ایک اور طریقہ بھی اختیار کیا۔۔۔اس نے اپنے احباب کو بے شمار خطوط تحریر کیے۔ شاید بلوچستان میں سب سے زیادہ خطوط امین کھوسہ اور یوسف مگسی نے لکھے۔ اُس زمانے کے اخبارات میں یہ خطوط چھپتے رہے۔ امین کھوسہ نے زیادہ تر خطوط محفوظ رکھے اور بعد میں شائع کرائے۔ انعام الحق کوثر کا احسان ہے کہ اس نے اِن خطوط کو پہلی بار کتابی صورت میں تا ابد محفوظ کر دیا۔ میں نے اُس زمانے کے اخبارات دیکھے، کوثر صاحب کے جمع کردہ خطوط کی چھان پھٹک کی اور ایک آدھ خط اُس زمانے کے اکابرین کے ورثا سے حاصل کر کے اُن سب کو کتابی شکل میں 2017 میں چھاپ دیا۔

یہ خطوط مختلف لوگوں اور مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ اُس کے دستیاب خطوط زیادہ تر میر سہراب خان ڈومبکی، میر تاج محمد خان ڈومبکی، مولانا عبدالکریم ناظم جامعہ عزیزیہ جھل، اور محمد امین کھوسہ کو لکھے گئے ہیں۔ بہت سارے خطوط میں مقام اور تاریخ دیا ہوا ہے۔ کچھ ایسے ہیں

جن پہ مقام یا تاریخ نہیں ہے مگر اُس زمانے کے اخبارات کی تاریخیں دیکھ کر سال اور ماہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مگر افسوس کہ کچھ خطوط بہت اہم ہیں مگر ہم اُن کی جائے تحریر اور ماہ و سال کا اندازہ نہ لگا سکے۔ اگر مستقبل کا محقق یہ کام کر سکے تو ممکن ہے انہی خطوط کے ذریعے ہلچل بھرے اُن سات برسوں کی سیاسی اور معاشی ہسٹری واضح ہو جائے!۔

اب تک اس کے دستیاب شدہ خطوط باسٹھ ہیں۔ یہ خطوط 1928 سے لے کر 1935 مئی تک کے ہیں۔ یعنی سات سالوں پہ محیط۔ مگر علمیت یکساں بطور پر کمال کی ہے۔

اپنے خطوط میں مگسی صاحب کثرت سے قرآنی آیات یا حدیث استعمال کرتا رہتا تھا۔ کہیں سیدھا سیدھا عربی میں اُسے لے آتا اور کہیں ترجمہ بھی دے جاتا۔ یہ بات اس پہ منحصر تھی کہ جس کو خط لکھا جا رہا ہے وہ عربی، یا قرآن و حدیث سے کتنی واقفیت رکھتا ہے۔ عالم کو وہ ترجمہ کے بغیر آیت یا حدیث بھیجتا، اور دوسروں کو سمجھانے کی خاطر ترجمہ کے ساتھ لکھ ڈالتا۔ ڈاکٹر خالد خٹک کی تحقیق کے مطابق مگسی صاحب نے اپنے چودہ خطوط میں 43 آیتیں ڈال دیں۔ ترجمہ کردہ آیتیں تین ہیں، غیر ترجمہ کردہ قرآنی آیتیں 24 ہیں اور ترجمہ نہ کردہ آیتیں پانچ ہیں۔ تین قرآنی آیتیں ایک سے زائد بار استعمال کی گئیں (10)۔ وہ اِن احادیث اور آیات کو تلمیحات، استعارات اور تشبیہات کی طرح یوں استعمال کرتا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی قرآن فہمی بے مثال تھی اور وہ مکمل طور پر اس رنگ میں ڈھلا ہوا تھا۔

اس کے خطوط اس پورے منطقے میں بالعموم اور بلوچستان میں بالخصوص اردو نثر کا ایک شاہکار اور قیمتی سرمایہ ہیں۔ اردو زبان کی شائستہ ترین نثر۔ مگسی صاحب کے اِن خطوط میں آپ کو بہت نفیس مزاح بھی ملے گا۔ اور ایسے حوالے بھی ملیں گے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے زمانے کی ادبی دنیا سے اس کی شناسائی کس قدر گہری تھی۔

اس نے اپنے نظریات کی تفصیل و تشریح کے لیے بھی خطوط کو استعمال کیا ہے۔ یہ تاریخی اور لسانی حوالے سے ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ یوسف ایک مخلص اور اچھے انسان کے بطور اپنے یاروں دوستوں کو اپنے محسوسات اور عزائم، تکالیف اور رکاوٹیں، فتح اور نامرادیاں لکھتا تھا۔ مولانا

ظفر علی خان نے اس کی انہی اوصاف کے پیشِ نظر لکھا:

لفظِ بلوچ مہر و وفا کا کلام ہے
معنی ہیں اس کلام کے یوسف علی عزیز

اس کے بعض خطوط ادب، جمالیات، فلسفہ اور سیاسی معیشت کے بارے میں انتہائی بلند درجے کے حامل ہیں۔ وہ حالات کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے دل میں جو تڑپ رکھتا تھا اور جو کسک محسوس کرتا تھا اس کا بھی اظہار کیے بغیر نہیں رہتا۔ کمال یہ ہے کہ ان نجی خطوں میں وہ بالکل بے تکلف نظر آتا ہے۔ ان میں ہمیں سادگی، شگفتگی، شوخی، خلوص، ہمدردی، انکسار، خود داری، اصول پرستی، قناعت پسندی اور مقاصد کی برتری ملتی ہے۔ اس کا انداز بیان نہایت متاثر کن اور توانا ہے۔(11)

یہ خطوط بذاتِ خود سیاست و ادب کا فن کارانہ امتزاج ہیں۔ بے تکلف خطوط جن میں وہ بہت فی البدیہہ انداز میں بات کرتا ہے، بلا واسطہ۔ دل کی بات مخاطب کے دل کے اندر پیوست کر جاتا ہے۔ مگسی صاحب کی تحریر میں ویسے ہی شوخی بہت ہے۔ وہ بہت زندہ خطوط لکھتا تھا، شگفتہ۔ امین کھوسہ کو اسی نے تو لکھا تھا؛ ''سچ لکھو کہ ہمیں یاد کرتے ہو؟ کسی کے سر کی قسم جو جھوٹ لکھا''۔

یہ خطوط دلچسپ بھی بہت ہیں۔ ان میں بوریت، سرداریت، علامہ ایت، اور خود نمائی نام کو نہیں۔ سادہ، رواں اور پُر بہار۔

یہ بھائی بندی اور ہمدردی سے بھرپور خطوط ہیں۔ مگر یہ بہت خودداری بہت اصول پرستی میں ڈوبے ہوئے زوردار اور اثر والے خط تھے۔

ایک خط کا اختتام اِن الفاظ میں کرتا ہے:

''دنیائے جنگ و نفرت آباد کا ایک شکستہ نصیب
ایم یوسف عزیز''

اسی طرح وہ ایک دوسرے خط میں یہ انوکھا اختتام کرتا ہے:

میں ہوں اپنی کائنات
کا خالق
عزیز (امین کوخط)

مگسی صاحب کے خطوط میں اعلیٰ نثر کا ایک نمونہ دیکھیے:

''قسم ہے آپ کی کہ ہم بھی کبھی ملاّ رموزی (12) (کے استاد نہ سہی) ہم پایہ سمجھے جاتے تھے اور تین تین چار چار صفحات پر بلا دھڑک، بلا سوچے گلابی اردو کا آسمانی لہجہ لکھتے تھے اور تھکتے ہی نہیں تھے۔ احباب کے جوابی خطوط اس پر گواہ ہیں کہ ہم ملاّ رموزی (ننھے میاں کی والدہ کے بغیر) ہوتے جاتے ہیں۔ مگر کیا کہا جاوے اس غیر متوقع اور بے محل ایامِ شباب کی لیڈری کو جو ہمارا عندیہ دریافت کیے بغیر قضائے مبرم کی طرح گلے پڑ گئی ہے اور جیل بھیجے یا سر کو زیبِ دار کیے بغیر پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ ہم جیسے کور ذوق آدمی بھلا منشائے فطرت یا مصلحتِ الٰہی کو کیا سمجھیں، سوائے اس کے کہ ''مولانا'' اور ''لیڈر'' کے خطابات نے ہمارے شباب اور اس کے لوازمات (تاثرات نہیں) کا خون کر دیا ہے۔ ماتمِ شباب کا ایک ننھا سا گیت، جو آج کل ہمارے وردِ زبان ہے، سناتا ہوں؛.....''یاد ایامیکہ میں لیڈر نہ تھا''۔

اُس کی نثر کا یہ ٹکڑا تو میں آپ سے ضرور پڑھواؤں گا:

''کہیں تو ایسا ہوتا ہے کہ اغراض و ہوس، مداہنت و باطل پرستی کے سلاسل کو توڑنے کے لیے ایک کارخانہ آہنگری کا ہتھوڑا لے کر اُٹھتا ہے اور گن گن کر ایک ایک کڑی کو بتدریج توڑ دیتا ہے، اور یا، ایک زبردست اور باطل شکن ہاتھ بلند ہوتا ہے اور پوری قوت سے ایک ہی جھٹکے میں تمام کڑیوں کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ اربابِ بینش اور اصحابِ بصائر پر واضح ہے کہ یہاں کے اوہام و رسومات کے پرستار بلوچوں کے خرمن باطل پرستی کو جلانے کے لیے کسی دیا سلائی یا تیل کی ضرورت نہ پڑی بلکہ ایک بجلی تھی جو اُٹھی، چمکی اور گری۔ خرمنِ اباطیل کو گردن موڑ کر دیکھتا ہوں تو اب خاک کا ایک ڈھیر معلوم ہو رہا ہے۔''(13)

مگر، خوبصورت و رواں اردو دیکھتے دیکھتے یہ بھی جان جایئے کہ اُسے ضروریات ولوازماتِ عہدِ شباب کو دبانے میں کتنی اینگلزی ریاضت ومحنت کرنی پڑ رہی تھی۔ ایک یوسفی طاقت چاہیے ہوتی ہے ایک نوجوان نواب زادے کو شراب و شباب سے دور رہنے کو۔ منڈیلائی صبر کی ضرورت ہوتی ہے مستقل مزاجی کے ساتھ عوام الناس کی آدرشوں کے ساتھ حتمی طور پر جڑے رہنے کو۔ ایک گویرائی شجاعت چاہیے ہوتی ہے بلوچستان میں سرداروں سے ٹکر لینے کو۔ ایک لیننی احساسِ ذمہ داری ہی اپنے نظریات کے ابلاغ کے کثیر ذرائع تلاش کرواتا ہے۔

۔۔۔۔ یوسف ان سب خصوصیات کا مجسم مجموعہ تھا۔

ریفرنسز

1۔ ڈاکٹر عنایت۔ مقتدرہ۔ صفحہ 512

2۔ خان۔ عبدالصمد۔ زماژوند............ جلد نمبر 2، صفحہ 417

3۔ روزنامہ۔ زمیندار، لاہور 10 جولائی 1933

4۔ ڈاکٹر عنایت۔۔ مقتدرہ۔۔۔۔ صفحہ 506

5۔ کوثر، انعام الحق۔ نقوش بلوچستان۔ 2005۔ ادارۂ تصنیف وتحقیق بلوچستان۔ صفحہ نمبر 161

6۔ عامر وامین۔۔۔ صفحہ 103

7۔ کاظمی، مسعود۔ دبستانِ ملتان۔ 2015۔ خوشنود پرنٹرز۔ صفحہ 389۔

8۔ افروز، خورشید۔ مشاہیر بلوچستان جلد چہارم۔ 2017۔ نیو کالج پبلی کیشنز کوئٹہ۔ صفحہ 36

9۔ اچکزئی، عبدالصمد خان۔ زماژوند اوژوندون۔ جلد نمبر 3۔ 2004۔ پبلشر نہ دارد۔ صفحہ 266

10۔ خٹک، خالد۔ قرآن اینڈ حدیث اِن دِی لیٹرز آف یوسف عزیز مگسی۔ 1913۔ بلوچستان ریویو جلد 28، نمبر 1۔ بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ۔ صفحہ 91-97

11۔ کوثر، انعام الحق۔ نقوشِ بلوچستان۔ 2005۔ ادارۂ تصنیف وتحقیق بلوچستان۔ صفحہ نمبر 160

12۔ ملا رموزی: طنز ومزاح والا لکھاری تھا۔ وہ گلابی اردو کا خالق جانا جاتا ہے۔ اُس کی ایک ضخیم کتاب ''ازواج الہند عرف عورت ذات''۔ اُس کا پورا نام حضرت ضیاء الملک رموزی، فاضلِ۔ الہیات، ایم اے، آر اے، ایس

(لندن)۔ ایم ایل ایس (فلاڈلفیا امریکہ) لکھا ہے۔ اس کتاب کا ایک باب ''بلوچی بیوی'' کے نام سے بھی ہے۔ ساڑھے چار سو صفحات کی ہے۔ اس کی دوسری کتاب کا نام ''خطوطِ رموزی'' ہے جو 200 صفحات کی ہے۔ تیسری کتاب کا نام ہے ''لاٹھی اور بھینس''۔ یہ ڈیڑھ سو صفحے کی کتاب ہے۔

13۔ مری، شاہ محمد۔ یوسف عزیز مگسی کے خطوط۔ 2017۔ یوسف عزیز مگسی چیئر۔ یونیورسٹی آف بلوچستان کوئٹہ صفحہ۔ 23

چھٹا چیپٹر

شخصیت

1۔ شفیق ونرم دل آدمی

یوسف عزیز ظلم وناروائی کے خلاف ہمیشہ ایک بہادر اور مضبوط انسان نکلا۔ وہ عام انسانوں کے معاملے میں انتہائی حساس اور نرم دل انسان تھا۔

اس نے 21 جنوری 1930 کو اپنے دوست تاج محمد ڈومکی کو خط میں لکھا: ''زمانے کے نشیب وفراز، بھائیوں کی بے وفائیاں، قوم کی بے اعتنائی کوئی معمولی بات نہیں ہیں۔ ان سب باتوں نے میرے دل ودماغ پر سخت برا اثر کیا ہوا ہے''۔

اپنے دوست محمد امین کھوسہ کو 20 دسمبر 1931 میں لکھا؛''سندھی شیکسپیئر امین بھائی' آپ کو پچھلے دنوں زمیندار اخبار کی چند کاپیاں بھیجی تھیں جن سے میرا مقصد اشاعت کا تھا۔ تاکہ میری نالہ فشانی کسی کو میرا ہم نوا بنا سکے۔ روتا ہوں کہ اوروں کو رُلاؤں۔ اگر کسی بھائی نے اس اشاعت سے کچھ اور معنی سمجھے ہیں تو اُسے خدا سمجھے''۔

اسی طرح اس نرم دل اور حساس شخص نے لندن سے 24 مئی 1934 کو محمد حسین عنقا کو لکھا:''باور کرو کہ تمھارے خط نے بیقرار کیا۔ آنکھیں بھر آئیں ۔۔۔۔خان (عبدالصمد خان

اچکزئی) کو تین سال کی سزا دی گئی۔ کیا یہ صحیح ہے؟۔عنقا یقین رکھو،اس وقت جب سطریں لکھی جارہی ہیں، دل،جگر،جسم کا ذرہ ذرہ آنسوؤں سے بھرا ہوا ہے۔''(1)

2۔القابات گریزی

زیرک و دانا یوسف اپنے تجربے اور مشاہدات کے نتیجے میں سرداریت اور نوابیت کا انتہائی مخالف بنا تھا۔اس نے یہ اخذ کرلیا تھا کہ بلوچستان کی ترقی اور خوش حالی کے لیے سرقبیلوی نظام ایک ضدی اور مضبوط رکاوٹ ہے۔ چنانچہ اس نے 1932 میں اپنے قریبی دوست امین کھوسہ کو لکھا کہ اس نے اپنے بکسوں وغیرہ پر سے ''نواب زادہ'' کا لفظ مٹوادیا تھا۔

جیسے کہ بتایا جاچکا ہے یوسف علی خان کو حالات نے نوجوانی ہی میں سیاست کے میدان میں دھکیل دیا تھا۔ یہ تعلیم یافتہ اور جہاندیدہ نوجوان جب ترقی یافتہ دنیا کے مقابلے میں غاروں کے زمانے میں زندگی بسر کرنے والی اپنی قوم کو دیکھتا ہے تو اس کا ضمیر،اس کا احساس اور اس کی حمیت ہل کر رہ جاتے ہیں۔وہ اپنا آرام وآسائش تج دیتا ہے اور جیل وجلاوطنی کی آلام بھری زندگی اپناتا ہے.....اور یہ فیصلہ وہ اپنی آخری سانسوں تک نبھاتا ہے۔ یوسف علی خان کو اپنی اِس زندگی کی ساری پابندیوں کا احساس تھا۔ہم پہلے ہی اُس کا وہ مشہور فقرہ لکھ چکے ہیں جس میں اس نے کہا تھا کہ،''مولانا اور لیڈر کے خطابات نے ہمارے شباب کے لوازمات (تاثرات کا نہیں) کا خون کردیا ہے.....''

چنانچہ یہ نوجوان عقل وفہم کی قدردانی پہ وقف ہوجاتا ہے۔اس کی روح کی ساری قوتوں کا رخ مستقبل کی طرف ہوتا ہے.....اور مستقبل تو امید کا نام ہے۔امید، جو بہت رنگارنگ، واضح اور دلکش روپ دھارتی ہے۔امید،جس کی بنیاد صرف ماضی کے تجربے پر نہیں بلکہ آنے والی مسرتوں کے خیالی امکان پر بھی ہوتی ہے۔آئندہ کی مسرتوں کے خوابوں نے دوسروں کو ہم راز بنا کر مگسی صاحب کو اس عمر میں سچی مسرت کی سوغات عطا کردی۔اور وہ بہت بے قراری سے اس مسرت کے حصول کے لیے تگ ودو کرتا رہا۔

بندہِ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم

حیرت کی بات ہے کہ اُس کا 1932 کو نکالا ہوا نتیجہ آج تقریباً سو برس بعد بھی بلوچوں کے دلوں میں سرایت نہ کرسکا۔ہم ابھی تک بلوچ، یا انسان نہ بن سکے ہیں اور اپنے اپنے قبیلے کی رسی اپنی گردن میں رضا کارانہ باندھے ہوئے ہیں۔ہم ابھی تک ''میر، وڈیرہ، سردار، نواب، اور نواب زادہ'' کی کثافت کی ٹوکری اپنے سروں پر ڈھو رہے ہیں۔امتیاز اور چھوت چھات ابھی تک بھرپور جوبن کے ساتھ بلوچستان کی تھرکتی ستھری ہواؤں کو ابلیسی بناتا جارہا ہے۔اگر کوئی بڑی تحریک نہ چلی تو اگلی کئی دہائیوں تک بھی اسی منحوس نیوکلیئس کے گرد طواف کرنا، سیاسی وسماجی کارکن کا مقدر رہے گا۔

3۔مذہبی آدمی

یوسف علی مگسی نے خود ایک خط میں اپنے بارے میں لکھا؛'' ہم قدرے مذہبی آدمی ہیں''۔ میں اپنے بزرگ کے استعمال کردہ اِس لفظ ''قدرے'' کو نکال کر اُس کی جگہ پر لفظ ''بہت'' ڈال دیتا ہوں۔

اُس کی زندگی کے عجب مراحل ہیں۔ وہ شروع شروع میں تو خلافت تحریک سے بہت متاثر تھا۔ پوری دنیا میں مترقی مذہبی (اسلامی) انقلاب لانا چاہتا تھا۔فرنگ کی ہر بات سے نفرت کرتا تھا۔حتیٰ کہ وہ اپنی تحریروں میں ڈارون اور اس کا نظریہ ماننے والوں کو انتہائی حقیر گردانتا تھا اور لگتا ہے کہ محض انگریز کو بھگانا اور اس کی جگہ ایک مسلمان حکومت قائم کرنا (ایک ہلکی پھلکی روشن خیالی کے ساتھ) اس کا مطمع نظر تھا۔

1932 کو وہ ایک اسلامی انقلابی ہے؛ وہ جیکب آباد میں ایک انجمن حزب اللہ یعنی خدائی فوج کی بنیاد رکھنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے جو دینِ الٰہی اور قیام بردینِ الٰہی کی تبلیغ کرے گا۔(2)

وہ زندگی بھر مذہبی شخص ہی رہا۔

میں حیران تھا کہ اتنا مذہبی شخص ہوکر یہ امیر زادہ حج کیوں نہ کرسکا۔اس سلسلے میں جناب

امین کھوسہ کے ایک مضمون میں ایک مختصر سا تذکرہ ملا۔ یہ مضمون ہفت روزہ 'البلوچ' کے 3 دسمبر 1933 میں چھپا تھا۔

''قریباً ڈیڑھ برس کا زمانہ ہوا، جَھل کے سردار نواب یوسف علی خان، نواب زادہ یوسف علی خان کے نام سے ڈلہوس میں قیام پذیر تھے۔ حج پر جا رہے تھے۔ راستہ میں بیمار ہو گئے اور انھیں اپنا ارادہ منسوخ کرنا پڑا''۔ یوسف نے بھی اپنی بیماری کو حج پہ نہ جانے کا سبب قرار دیا تھا۔ مگر یہ بیماری جگر کی تھی یا گردے کی ڈاکٹر بھی سمجھ نہ پایا تھا۔ (یوسف مگسی خطوط۔ صفحہ نمبر 66)

4۔ عاجزی، انکساری

فطرت نے مہربان ہو کر اچھی عادتیں یوسف کو ودیعت کی تھیں۔ یہ ایک معجزہ ہوتا ہے کہ نواب گھرانے والا فرد طبیعت میں عاجزی وانکساری پیدا کرے۔ یوسف وہی معجزہ تھا۔ آپ کو اس کی زندگی، اس کی تحریروں اور اس کی تقریروں کے اندر جگہ جگہ اس کی شرافت، عجز، فروتنی اور انکسار کی جھلکیاں ملیں گی۔

اُس میں گردن اکڑائی اور نوابیت بالکل نہ تھی۔ وہ ''آئی ایم'' کی آلائش سے یکسر پاک تھا۔ وہ اپنے لیے یہ جملے استعمال کرتا ہے: ''ہم جیسے شکستہ رباب، سوختہ دلوں کے لیے.....ہم سے متاعِ حسن باختہ سرد ذوقوں کے لیے'' (4 نومبر کو امین کو خط)۔

یا پھر:

''آپ کا بدنصیب ہمہ تن اشک۔۔عزیز مگسی

(4 مئی 1934۔لندن'')

ایک خط میں امین کھوسہ کو لکھا: '' میری خرافات سے اگر رنجش محسوس ہو تو معاف کیا جاؤں۔۔۔''

5۔ سچا دوست

یوسف عزیز مگسی، عبدالعزیز کرد، عبدالصمد اچکزئی اور امین کھوسہ سے زبردست دوستی میں تھا۔ ہم نظریہ، ہم کام اور ہم سفر تکون تھا یہ۔ ظاہر ہے سچی دوستی ہی نے اس ہمکاری کو برقرار رکھا۔

امین کھوسہ نے اُس کی دوستی کے بارے میں لکھا: ''میرے دوستوں میں یوسف علی خان مرحوم ایسا تھا جس سے مجھے کوئی بات کہہ کر زیادہ تر دہرانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی''۔(3)

6۔ انتھک ورکر، بے طمع لیڈر

اُس زمانے میں بالعموم، اور یوسف عزیز مگسی کی سیاست بالخصوص بغیر کسی لالچ وطمع والی سیاست تھی۔ اُسے نہ صلے کی تمنا تھی اور نہ ستائش کی پرواہ۔ اس کے ہاں ضمیر اور رُوح کا مطمئن ہونا کارِ زندگی کا سب سے بڑا معاوضہ تھا۔ اپنے دوست محمد حسین عنقا کو لکھتا ہے: '' آپ جانتے ہیں کہ میں نے جس قدر بھی میرے عزائم کا احاطہ تھا، اُس کے مطابق خلوص اور بے غرضی سے اپنی قوم اور ملک کی خدمت کی اور اس خدمت کا معاوضہ اگر چاہا بھی تو صرف یہی کہ میرا ضمیر اور میری رُوح مطمئن رہے''۔(4)

یوسف عزیز مگسی کی زندگی بڑی فعال اور انتھک جدوجہد میں گُزری۔ بیکاری وکاہلی کو وہ خسارہ کہتا تھا۔ ''اگر مر گئے تو معراجِ زندگی، اگر زندہ رہے تو کام کریں گے۔ بہر حال ہم کسی بھی طرح خسارے میں نہیں۔ ہاں خسارے کی صرف ایک صورت ہے کہ نہ مریں اور نہ کام کریں۔ یعنی گُھل گُھل کر ہجرِ یار میں جیتے رہیں۔''(5)

7۔ دولت فتنہ ہے

یوسف عزیز مگسی دنیاوی جاہ وحشمت اور مال ودولت کو فساد سمجھتا تھا۔ '' مال وجائداد تو ویسے ہی ایک فسادِ آدمیت سے کم نہیں۔''(6)

یوسف عزیز مگسی کو زندگی میں زبردست تنگ دستیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اپنے جگری یار امین کھوسہ کو اُسی تنگ دستی میں لکھا: ''ایک طویل مستقبل سامنے ہے۔ سرمایہ ختم۔۔۔ کبھی تجارت کا سوچتا ہوں مگر تجربہ ندارد۔ اتنے پیسے باقی نہیں رہے کہ گھر بیٹھ کر کھاتا جاؤں۔ ملازمت کے لیے جس تعلیم کی ضرورت ہے، وہ میسر نہیں''۔(7)

8۔ جمہوری آدمی

اچھے انسانوں کی طرح یوسف عزیز مگسی بھی بحث، دلیل، قائل کرنے اور قائل ہونے والے آدمیوں میں سے تھا۔ وہ چونکہ انجمن اتحادِ بلوچستان اور آل انڈیا بلوچ کانفرنس جیسی ڈسپلن والی پارٹیوں میں رہا تھا، اس لیے وہ آمرانہ انداز اپنا سکتا ہی نہ تھا۔ اُسے بحث مباحثے کے بعد فیصلوں تک پہنچنے کی عادت تھی۔ وہ ہر انسان کو صاحب الرائے بنانے کی جدوجہد میں زندگی گزار چکا تھا۔ جب بھی اُسے کوئی پیچیدہ مسئلہ درپیش ہوتا وہ بلا جھجک اپنے دوستوں سے مشورہ کر لیتا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کوئی بھی فیصلہ اُس کا ذاتی نہ ہو بلکہ اس فیصلے میں دیگر افراد کی رائے بھی شامل ہو۔

کسی ایسے ہی پیچیدہ مسئلے کے وقت اپنے کامریڈ امین کھوسہ کو لکھتا ہے: ''بھائی امین، اس وقت میری پوزیشن ایک عجیب حالات میں گھری ہوئی ہے۔ آپ نے پل صراط کا نام سُنا ہوگا، بس آپ کا دوست ایک ایسی ہی پگڈنڈی پر جا پہنچا ہے۔ آپ سے ضروری معاملات میں استصواب کرنا ہے۔ جو خطوط کے ذریعے نہیں ہوسکتا۔ اور اگر آپ نے یہاں آ کر مجھے مدد نہ دی تو بعد میں نہ کہیے گا کہ میرا فیصلہ غلط تھا۔ میں اب ایک مسئلے کو فیصل کرنے کے گرداب میں مصروف ہوں اور نہیں چاہتا کہ بسرِ خود اپنی ذمہ داری پر کروں''۔(8)

9۔ لوگوں کی بے اعتباری پہ

ہمارے سیاسی ورکرز، لیڈر، اور شاعر و دانش ور ہمیشہ گلہ مند رہتے ہیں کہ لوگ اُن پہ بے جا تنقید کرتے ہیں۔ بالخصوص سوشل میڈیا آنے کے بعد ہر شخص تبصرہ کا پتھر ہاتھ میں لیے پھرتا ہے۔

اور خواہ اُس خاص شعبے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ جانتا ہو، مگر اللہ کے واسطے دوسرے کو وہ پتھر دے مارتا ہے۔

مگر غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ آج کا معاملہ نہیں ہے۔ انسانی تاریخ میں ہر سچے اور اچھے انسان کو ان سولیوں پہ بار بار چڑھایا جاتا رہا ہے۔ آپ مگسی صاحب ہی کا کیس دیکھیے:

''کیا لکھوں۔ اور پھر تم کو! تمہارے خط کی ہر سطر اور ہر لفظ نمک بر جراحت سے کم نہیں۔ مگر:

ہر چہ از دوست رسد نیکو است

''آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ مجھے اپنی خامیوں کا اعتراف ہے۔ اپنی کافریت کی تردید لاحاصل، فضول۔ اپنی بے ریشی اور اسی وجہ سے صفِ اسلام سے اخراج کے الزام پر بھی سرافگندگی۔ دعا فرمائیں کہ میں آپ کے خیال کے مطابق بن جاؤں۔

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

''اپنی کم مائیگی، احباب کی جانب سے شکستِ اعتماد، اربابِ اقتدار کے حبس و زندان کا خوف اور حصولِ تعلیم کے لیے تلاشِ فرصت نے مجھے اس قدر سراسیمہ بنا دیا ہے کہ اب وہ بھی:

جن سے امیدِ وفا تھی ہم کو

''میرے قول و فعل اور میرے ظاہر و باطن کو برعکس اور متضاد سمجھنے لگے ہیں۔ کاش۔۔۔

جوشِ وحشت میں کسی سمت نکل جاؤں گا
ایک فہرست مرے پاس ہے ویرانوں کی

''کبھی انور کے نقاب میں، کبھی کسی اور کے لباس میں غیر مسلم، جاہل، خودغرض، مکار بنایا جا رہا ہوں۔ کبھی کیا، کبھی کیا۔ اور واللہ میرے لیے یہ آپ کی تمام شاعری شبلیا نہ پھول سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ آخر میں حیران ہوں کہ کیا کروں۔ پہلے کی حالت کو چھوڑیے۔ مکمل ایک عشرے کی غیر حاضری میں یہاں تقریباً تین درجن خطوط جمع تھے جن میں جناب کا الہامی صحیفہ ایک نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ 12 خطوط کے کاتب حضرات فرماتے ہیں کہ بلوچستان نہ آؤ، جن میں قومی دردمند

اور معزز ہستیاں بھی شامل ہیں۔ اور بقیہ خطوط میں سے چند ایسے ملے کہ میں جلد بلوچستان پہنچوں۔ اب میں کیا فیصلہ کروں۔ اگر آپ یہ سمجھیں کہ مجھے وہاں آنے سے خوفِ زنداں مانع ہے تو سوائے اس کے کہ آپ کی تنگ نظری یا اپنی بدقسمتی کا ماتم کروں، اور کیا کرسکتا ہوں۔ اگر بقول ہمارے ریاستی خرافاتی پیغمبر خواجہ فیروز الدین ریونیومنسٹر (جو ظلی و بروزی الہامات میں پاپائے قادیان کے خلیفۂ اول کی حیثیت رکھتے ہیں) کے آپ یہ سمجھیں کہ میں یہاں رنگ رلیاں منا رہا ہوں اور؛

جوانی کی راتیں ، مرادوں کے دن

بسر کر رہا ہوں، تو شہادت کے لیے سوائے اس کے کہ میں خالقِ ارض وسما کی طرف رجوع کروں (جس نے میرے ہم نام بے گناہ کی عصمت کی شہادت بے زبان نو ماہ کے بچے سے دلوائی تھی) اور کیا کرسکتا ہوں۔ واللہ علیم بالعباد۔

میں ایک جاہل علاقے کا جاہل فرد ہوں۔ سیاسیات سے نابلد ہوں اور اب تک بقولِ امین صاحب داڑھی منڈواتا ہوں، نماز نہیں پڑھتا اور ایک ایسا غلام ہوں جو اپنے آقا کی زبان بھی نہیں سمجھتا۔ اس لیے قبل از تکمیل خود اس وادیِ پُرخار میں کودنے سے ہچکچاتا ہوں۔ اور ادھر میرے غلط فہم وغلط بین قدردان بھائیوں کا اصرار ہے کہ۔۔۔ اور میری جھجک پر مجھے سب کچھ۔۔۔ سمجھا اور گردانا جاتا ہے۔ ان جذبات کے تحت پرسوں ''کنگن'' میں ہی کہا تھا نہ کہ:

دھوکے میں پڑا دیکھ کے ظاہر مرا کم ہیں
اے تنگ نظر دیکھ تو میرا نہاں اور

''ہفتے کے اندر اندر اپنے لیے کوئی لائحۂ عمل بناؤں گا کہ آیا مجھے طعن وتشنیع اور از وقت اُکساہٹ پر خلافِ ضمیر اپنی استطاعت سے زیادہ بوجھ اُٹھانے کے لیے میدان میں کودنا چاہیے یا اپنی اصلاح؟''(9)

25 مئی 1935 کو میر شیر علی بنگلوری کے نام خط میں جو (غالباً اس کا آخری خط ہے) لکھتا ہے: ''مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ جو میرے متعلق کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں، ہمیشہ اس طرح کیا گیا ہے اور ہو رہا ہے بلکہ ہوتا رہے گا۔ پبلک کے کمزور حافظہ سے ناجائز فائدہ اٹھانے

والے ان کے خادموں کو ہمیشہ رُسوائے خلق کرنے کے لیے الزامات بناتے رہتے ہیں۔ اور اکثر وبیشتر کامیاب ہوجاتے ہیں''۔

مگسی پہ لگے یہ الزامات بعد میں بزنجو پہ لگے، اُس کے رفقا پہ لگے اور آج اُن دونوں کے نقشِ قدم پہ چلنے والوں پہ لگ رہے ہیں۔ اور دکھ کی بات یہ ہے کہ دلخراش الزامات اور بہتان بہت نیچ اور حقیر خصلتوں والے لوگ لگاتے ہیں۔

10۔ میرٹ

یوسف عزیز مگسی زندگی کے معاملات میں اہلیت کو اولین زینہ کامیابی سمجھتا تھا۔ اس کے خیال میں جب تک انسان میں کسی کام کرنے کی اہلیت وصلاحیت نہیں ہوگی وہ کام کبھی بھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچے گا۔ محض جذبات سے کام نہیں چلتا۔

اس نے اپنے ساتھی محمد امین کھوسہ کو ایک خط میں لکھا: ''۔۔۔ میں کہتا ہوں کہ ایک انسان کو کسی کام کے شروع کرنے سے پہلے اپنے آپ کو اس کام کا اہل بنانا چاہیے۔ دس من کا بوجھ اٹھانے سے پہلے ایک آدمی کو ورزش کے ذریعے اپنے آپ کو اس بوجھ کے اٹھانے کے قابل بنانا چاہیے۔ ورنہ وہ ہنگامی وجذباتی کوشش یا تماش بینوں کی اکساہٹ پر اپنی طاقت کا موازنہ کیے بغیر ضد آمیز ہٹ کا نتیجہ شکستِ کمر یا خندیدگیِ جہاں کی شکل میں پائے گا''۔

11۔ مایوسی موت ہے

یوسف کی قوم اور اُس کی روحانی اولاد کو اُس کے یہ فقرے تو زبانی یاد ہونے چاہئیں:

''ہم یاس وحرمان کی رٹ لگاتے رہنے کے لیے پیدا نہیں ہوئے''۔

وہ کمال پُرعزم اور باہمت آدمی تھا۔ وہ مصائب ومشکلات کا مقابلہ کرتا تھا۔ مایوس ہونا تو اُس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ مایوسی کو موت سے تشبیہ دیتا تھا۔ اپنے دوست محمد حسین عنقا کو 24 مئی

1934 کولندن سے خط لکھا؛ ''مایوس ہونا مرنے سے بدتر ہے۔ اور انسانیت کے خلاف احمقانہ بغاوت ہے۔ مایوسیاں زندگی کے ہر قدم پر ہمیں ملیں گی، ان سے بغلگیر ہو کر روانہ ہو جانا ہی زندگی ہے۔ ٹھہر جانا موت ہے اور موت نام ہے مٹ جانے کا۔ میں بھی مایوس ہوتا رہتا ہوں۔ مگر یکسر مایوس نہیں ہو چکا، ہو چکنا ختم ہو جانا ہے''۔

اسی طرح وہ 23 مارچ 1934 کو محمد امین کھوسہ کو لکھتا ہے: ''جس طرح کثیف ہوا آمدو رفتِ نفس کو مشکل بنا دیتی ہے، بہ عین ہی میرا معاملہ ہے۔ مگر تم مجھے جانتے ہو، میں مایوس نہیں ہوا۔ مایوس ہونا ختم ہو جانا ہے۔ آرزوئیں آباد رہیں۔ خواہ کبھی بھی زلفِ یار تک رسائی نہ ہو، مگر دِل و دماغ کا معاملہ اس کے ساتھ ٹوٹنے نہ پائے''۔

5 اپریل 1932 کو امین کھوسہ کو لکھا: ''اور اگر انسان نہیں سُنتے یا بالکل انسان دنیا میں رہے ہی نہیں تو درختوں کو پہاڑوں کو اپنی رُوداد سُنائیں۔''

12۔ جسم وصورت

''یوسف! منحنی جسم کا ایک سادہ نوجوان طول وطویل خطابات سے معریٰ اور غیر جہاں دیدہ تھا۔ اس میں بھی ''فطرتِ تخلیق'' کی کمزوریاں تھیں اور ''محشرِ انسانیت'' میں وہ بھی اپنے لاکھوں بھائیوں کی طرح حیران و پریشان تھا۔۔۔ لیکن! اُس میں ایک جذبہِ تدبر کا عنصر زیادہ تھا۔ اُس کی قوتِ تنظیم، آہنی استقلال اور مشکل سے مشکل کاموں کو انجام دہی کی قابلیت نے اس کی ہستی کو اُبھارا۔ اُس نے چند افسردہ مشلہ کو دہرایا جن میں تدبر قومی موجزن تھا''!!(10)

ریفرنسز

1۔ مری، شاہ محمد۔ یوسف عزیز مگسی کے خطوط۔ 2017۔ یوسف عزیز چیئر یونیورسٹی آف بلوچستان۔ صفحہ 126

2۔ مری، شاہ محمد۔ یوسف عزیز مگسی کے خطوط۔ 2017۔ یوسف عزیز چیئر یونیورسٹی آف بلوچستان۔ صفحہ 35

3۔ جی ایم سید کو 2.7.11.1965 کو لکھا گیا خط (غیر مطبوعہ: ترجمہ: نواز کھوسہ)۔

4۔ مری، شاہ محمد۔ یوسف مگسی کے خطوط۔ صفحہ 121

5۔ مری، شاہ محمد۔ یوسف مگسی کے خطوط۔ صفحہ 82

6۔ مری، شاہ محمد۔ یوسف مگسی کے خطوط۔ صفحہ 26

7۔ مری، شاہ محمد۔ یوسف مگسی کے خطوط۔ صفحہ 93

8۔ مری، شاہ محمد۔ یوسف مگسی کے خطوط۔ صفحہ 85

9۔ مری، شاہ محمد۔ یوسف مگسی کے خطوط۔ صفحہ 95

10۔ منشی صحرائی سروری۔ مدیر مسئول ''چاند'' الہ آباد۔ ''اقوام بلوچ کا دور جدید بطلِ جلیل! نواب محمد یوسف علی خان عزیز کی مساعی جمیلہ۔''

ساتواں چیپٹر

لندن جلاوطن

1۔سرداری سے برطرفی

1933 کا کامیاب اور بڑا حیدرآباد جلسہ اپنے ساتھ آل انڈیا بلوچ کانفرنس کی قسمت میں موت کا پروانہ بھی لایا۔

محمد اعظم کی موت کے بعد اس کا بیٹا احمد یار جب خان بنا تو وہ بھی اپنی بادشاہی کے اولین ایام میں کانفرنس کے لیے آسانیاں پیدا کرتا رہا۔مگر یہ بات تو نظر آ رہی تھی کہ وہ خود بھی طبقاتی لحاظ سے خان تھا۔ وہ خود سرداروں کا محتاج تھا۔ نیز وہ مکمل طور پر آزاد بھی نہ تھا۔ بلکہ وہ انگریز کا حاشیہ بردار اور سرداروں کی بیساکھیوں پہ قائم تھا۔

اِدھر یوسف اور اُس کے ساتھی خان کی خانیت وحکمرانی کو تو کچھ نہیں کہتے تھے مگر وہ اس کے سب سے بڑے دست و بازو یعنی سردار کو استحصال اور قدامت کی علامت سمجھتے ہوئے اس کے خلاف مسلسل اور مستقل مزاج جدوجہد کرتے رہے۔

خان بظاہر بہت سادہ شخص تھا مگر حکمران خواہ جتنا بھی سادہ نظر آئے اپنی حکمرانی کو خوب جانتا ہے۔یوں تاریخ گواہ ہے کہ سیاسی ورکر اس غلط فہمی میں ہوتے ہیں کہ وہ حاکم یا سردار کو استعمال کر رہے ہیں مگر ہوتا اس کے برعکس ہے۔

چنانچہ حیدرآباد کانفرنس سرخ خطرہ بن کر انگریزوں، فیوڈلوں، سرداروں اور احمد یار کی آنکھوں کو خیرہ کر گئی۔ سماج کے اندرونی تضادات تو واضح ہو چکے تھے، اوپر سے متحدہ ہندوستان کے سارے آزادی پسند لوگ بلوچوں کے ساتھ یکجہتی کرنے لگ گئے۔ خاص کر لاہور کا ظفر علی خان اپنے اخبار زمیندار کے ساتھ بلوچوں کے شانہ بشانہ ہو چلے تھے۔

مگر اس سے قبل ہم کرونالوجی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے چلتے چلاتے میں اُس تار کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو وزیراعظم کلات نے نواب محمد یوسف علی خان مگسی کو بھیجی:

''ہز مائی نس پہلی مارچ کو آپ کی موجودگی ڈھاڈر میں چاہتے ہیں۔ مہربانی کر کے تار کے ذریعے جواب دیں۔''(1)

یوسفی رفقا کی نمائندگی میں بلوچستان صدیوں کی غفلت کے بعد بیدار ہوا۔ اس کے نوجوان چاہتے تھے کہ ان کا پسماندہ ملک بھی اخلاقی، اقتصادی، تمدنی اور معاشرتی لحاظ سے کم از کم ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے برابر ہو جائے۔ اخبار بلوچستان جدید اپنی 8 مئی 1934 کی اشاعت میں لکھتا ہے: ''مگر بلوچستان کی حکومت کے بعض عاقبت اندیش عمال اور ملک وقوم کے چند دشمن سردار مخالفت کر رہے تھے۔ (سردار اور ملک دشمن؟ تیری یہ مجال!)۔ جو غالباً یہ چاہتے تھے کہ آنے والی صدیوں تک بلوچستان تباہی اور زبوں حالی کے تباہ کن بھنور میں پھنسا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکار نے ایسے نوجوانوں پر ستم ڈھانا شروع کر دیا جو بلوچستان کی سرزمینِ بے آئین کے لیے آئینی حکومت چاہتے تھے۔ جو لوکل سیف گورنمنٹ مانگتے تھے۔ جو جرگے کی اصلاح اور اس کا آزاد انتخاب چاہتے تھے۔

''یہ لوگ بے زبان عورتوں کی حقِ وراثت سے محرومی، زرِ ولورا ور زرِ خون کی مخالفت کرتے تھے۔ اور جو تقریر وتحریر کی آزادی چاہتے تھے۔ یہ نوجوانوں کے وہ جرائم تھے جن کی پاداش میں وہ گردن زدنی کے سزاوار ٹھہرائے جا رہے تھے''۔

میر یوسف مگسی کی زیر قیادت اِن ساری سامراج دشمنی اور جمہوری جدوجہد کا مقصد بے عقل (یا بہت چالاک) حکمرانوں نے یہ سمجھا کہ وہ یہ سب کچھ سرداری حاصل کرنے کے لیے کر رہا

ہے۔ چنانچہ اُسے قبیلہ مگسی کی سرداری دی گئی۔

مگر حکومت کی غلط فہمی جلد ہی دور ہوگئی۔ اور دنیا نے دیکھ لیا کہ سرداری پانے پر بھی یوسف عوام کی تکالیف سے بے چین ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کوئی حربہ، کوئی لالچ، کوئی عہدہ اُس انقلابی کو عوام دوستی سے دور نہیں کر پا رہا تھا۔

لہٰذا اُس مصیبت سے نجات کے لیے کوئی اور تدبیر چاہیے تھی۔

اسی دوران سارے قبائل کے سردار یوسف عزیز کے خلاف شکایت لے کر اُس وقت کے فرمانروائے بلوچستان ایجنٹ گورنر جنرل کے پاس گئے اور خان کلات کے پاس بھی۔ اِس قصہ کو یوسف نے شاعری میں قلم بند کیا، جس کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں ہو چکا۔

انگریز بادشاہ گر تھا، روباہی پیچ وخم میں بہت استاد۔ اُس نے ہمارے گھنے درخت کو کاٹنے کا پکا ارادہ کر لیا۔ اور، اُس کے لیے ہماری سب سے بنیادی اور موٹی جڑ کا کاٹنا ضروری تھا۔ یوسف مگسی کو راستے سے ہٹانا اہم ترین ہدف بن گیا۔

مگر اسے یہ بھی معلوم تھا کہ خریدنا، دھمکانا، جھکانا کام نہیں دے گا۔ کوئی اور ہتھکنڈہ استعمال کرنا ہوگا۔

چنانچہ اے جی جی، سر نارمن کیٹر نے اُسے ملاقات کے لیے طلب کیا۔ اُس کے اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ، ویکفیلڈ کی ڈائری میں وہ گفتگو یوں درج تھی:

''آپ نوجوان ہیں اور آپ نے دوستوں کے انتخاب میں عقل مندی سے کام نہیں لیا ہے (یہی فقرہ ابھی تک یہاں کا چیف سیکریٹری یہاں کے عوام دوست سیاسی کارکنوں کو کہتا رہتا ہے)۔ میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ بارہ ماہ کے لیے بلوچستان چھوڑ دیں اور ولایت کے سفر سے اپنی فکر کو وسعت دیں۔ آپ یورپ کیوں نہیں جاتے اور وہاں جا کر خود اپنی آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھتے کہ یورپ کیسا ہے؟''

یوسف علی خان مگسی نے احتجاج کیا۔ ''میں اپنا وطن چھوڑنا نہیں چاہتا''۔

''تمھیں ہر حال میں وطن چھوڑنا پڑے گا۔ میں تمھیں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ

تم بلوچستان میں رہو اور مشکلات پیدا کرتے رہو۔ اگر تم عقل مند ہو تو رضا کارانہ طور پر وطن چھوڑ کر باہر چلے جاؤ۔ کسی کو یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ تم نے اس معاملے میں میرے مشورے پر عمل کیا ہے''۔

ساتھ میں، انگریز نے میر عبدالعزیز کرد کو گرفتار کرلیا گیا۔ اِس جرم میں کہ اس نے پنجاب کے اخبارات میں کچھ مضامین لکھے تھے۔ شاہی جرگہ سبی نے اُسے پانچ برس کی قید بامشقت کی سزا سنائی اور اسے مچھ جیل میں ڈال دیا۔

یہیں پہ بس نہ ہوا۔ 29 جنوری 1934 کو مگسی صاحب کے دوسرے کامریڈ عبدالصمد خان اچکزئی کو بھی مچھ جیل میں ڈال دیا گیا، کراچی اور حیدرآباد میں تقاریر کے جرم میں۔

یوں یوسف کے گرد گھیرا تنگ کیا جارہا تھا۔

یہاں ہم روزنامہ انقلاب کے 7 مارچ 1935 کا وہ مضمون نقل کریں گے۔ جس کا عنوان تھا؛ ''بلوچستان کے ساتھ کب انصاف ہوگا؟''

''۔۔۔ ایک طرف تو ہندوستان میں قانون حکومتِ ہند 1935 کے بارے یہ بحث جاری ہے کہ یہ غیر تسلی بخش، ناقابلِ اطمینان ہے۔ دوسری طرف ''غریب، بدنصیب اور بے زبان بلوچستان'' ابھی تک ان ابتدائی چیزوں سے ناآشنا ہے جو ہندوستان کے اندر سالہا سال سے نافذ ہیں''۔ اخبار نے سوال اٹھایا کہ بلوچستان کے لوگ حکومت کی بے توجہی کا شکار کیوں ہیں۔ بلوچستان ہندوستان کا جزو لاینفک ہے تو یہاں کے باشندوں کو وہ حقوق کیوں حاصل نہیں جن سے ہندوستان کے دیگر صوبوں کے لوگ مستفید ہورہے ہیں کیونکہ ''بلوچ بھی ویسے ہی انسان ہیں اور ان کے پہلو میں ویسے ہی دل اور ویسے ہی جذبات ہیں، وہ بھی اپنی فلاح و بہبود کی ویسی ہی تڑپ رکھتے ہیں''۔ اخبار نے قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کرتے ہوئے لکھا کہ، ''عبدالصمد اچکزئی سے ہندوستان کے تمام سیاسی حلقے واقف ہیں جو بے انتہا آئین پسند، پختہ خیال قومی کارکن اور عدم تشدد کے پکے حامی ہیں۔ انھیں بلوچستان کی حالت بہتر بنانے اور اہلِ بلوچستان کو کم از کم ابتدائی حقوق دلوانے کے ساتھ عشق ہے''۔

2۔ یوسف کی پُراسرار بیماری

آگے کے واقعات سے قبل اُس بیماری (یا اُن بیماریوں) کا تذکرہ ہوجائے جو یوسف کی تحریروں میں جابجا مذکور ہے۔

میر یوسف عزیز مگسی پہلی بار 1929 اپریل کو ایک خط میں اپنی ایک بیماری کا ذکر کرتا ہے:

''آپ اب خوش رہیں کہ مجھ میں اب وہ دیوانہ سری جو کہ تھی نہیں رہی۔ البتہ اُس کا خمار ہے''۔(2)

اسی طرح وہ بعد میں بھی اسی بیماری یا کسی اور بیماری کا تذکرہ کرتا رہا۔ اس نے امین کھوسو کو ایک اور خط میں لکھا؛

''۔۔۔ میں سونامرگ سے دس دن کے سفر کے بعد یہاں بیمار ہوکر پہنچا ہوں۔ بیمار ہوں اور تکلیف میں ہوں''۔

اسی خط میں آگے لکھتا ہے؛

''اس وقت ایک تو تکلیفِ بدنی، دوسرے۔۔۔ دماغی پراگندگی نے کچھ ایسا پراگندہ دل بنا رکھا ہے کہ بے سوچے جو جی چاہتا ہے، لکھ رہا ہوں، اس لیے معاف سمجھا جاؤں''۔

آگے چل کر واضح انداز:

''ہاں کہتا ہوں اور لکھتا ہوں کہ حقیقتاً بیمار ہوں۔ نہ صرف بیمار ہوں بلکہ تکلیف میں بھی ہوں اور لکھنے بیٹھا ہوں۔ کیونکر اور کیوں؟ اس کا اندازہ ساحل پر بیٹھا ہوا شخص نہیں لگا سکتا''۔

بیماری کے سلسلے میں لکھتے جاتے ہیں:

''آج کل ڈلہوزی میں مقیم ہوں،۔۔۔۔

آج کل ایبٹ آباد میں ہوں۔''

پھر امین کو خط کہ،

''حج پہ نہ جاسکا، بیمار ہوگیا تھا''۔

ایک اور خط میں:

''کیفیت کہ میں لکھ نہیں سکتا، پڑھ نہیں سکتا۔ قیام گاہ پر مسلسل آدھ گھنٹہ بیٹھنے سے یہ حالت ہو جاتی ہے جیسے کہ دو تنومند نوجوان گلا اور سینہ دبا رہے ہیں''۔

اسی طرح وہ ''عالم اضطراب'' جیسے الفاظ استعمال کرتا ہے:

''میرے جنون کی کرشمہ سازیوں''۔

یکم اپریل 1932 میں امین کھوسہ کو لکھتا ہے:

''دہلی میں جب معالج کے سامنے پیش ہوا تو بعد معائنۂ نبض ارشاد ہوا کہ اوہو! آپ اس کو معمولی بات سمجھتے ہیں؟ حرارت جگر اپنے انتہائی درجے تک پہنچ چکی ہے۔ سرد اور مقوی جگر شربت آپ کو بنا کر دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کسی ٹھنڈے مقام پر قیام کریں۔ کیا آپ شراب استعمال کرتے ہیں؟ نعوذ باللہ اُس بے چارے کو کیا علم کہ یہاں تو یہ قصہ ہے کہ:

مشعل بنا کے تابشِ داغِ جگر کو میں
راتوں کو ڈھونڈتا ہوں تری رہگذر کو میں

اُس کی اُس بیماری کا ایک اور تذکرہ 21 جنوری 1930 کو ایک خط میں ہمیں ملتا ہے:

''زمانے کے نشیب و فراز، بھائیوں کی بے وفائیاں، قوم کی بے اعتنائیاں کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ان سب باتوں نے میرے دل و دماغ پر ایک سخت برا اثر کیا ہوا ہے۔ مرضِ نسیاں تو بالکل اب ڈیرے جمائے بیٹھا ہوا ہے کہ نکلنے کا نام تک نہیں لیتا۔ علیٰ ہٰذا القیاس دماغی و قلبی مرض ملحق ہو چکے ہیں کہ میں اپنے مہربانوں کے آگے سخت شرمندہ و نادم ہوں۔

''سخت بیمار ہو گیا ہوں، حتیٰ کہ چل پھر نہیں سکتا۔ علاج دیسی یونانی شروع ہے، مذاقِ زندگی میں اگر تبدیلی ہو گئی تو خدا حافظ ورنہ حیدر آباد میں بموقع کانفرنس ملاقات ہو گی۔ یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں۔ نہایت مشکل سے چارپائی پر پیٹھ آسمان کی طرف کیے ہوئے قلم چلا رہا ہوں۔ باوجود

اس کے ایک گھنٹہ قومی معاملات کے کاغذات پر بھی دستخط کرنے کے لیے دیتا ہوں۔ دماغ کی خشکی سے رات کی نیند بالکل ختم ہو گئی ہے''۔

وہ ''البلوچ'' میں 16 اکتوبر 1932 کے مضمون میں خود کو اسی بیماری کے ہاتھوں ملتان میں زیرِ علاج لکھتا ہے۔

اسی طرح وہ لندن سے 4 مئی 1934 کو امین کھوسو کے نام اپنے خط میں لکھتا ہے:

''میں اپنے شگاف سینہ اور غم آلود دل کے ساتھ سخت مصروف ہوں، علاج کے بعد فرصت میں ہمہ تن مصروفِ تعلیم ہوں''۔

اسی طرح امین کھوسہ کو اپنے ایک خط میں لکھا:

''کراچی پہنچنے پر دو دن اچھا رہا اور خوب کام کیا۔ ۔۔۔اس کے بعد میں پھر صاحبِ فراش ہو گیا۔ انجکشن کے باعث چوبیس گھنٹے سخت بخار رہا۔

''ڈاکٹر کامل 90 دن مجھے زیرِ علاج رکھنا چاہتا ہے اور 14 انجکشن کا کورس میرے لیے تجویز کر چکا ہے تا کہ جڑ سے بیماری رفع ہو۔ کمزور ہوں، لیٹے لیٹے یہ عریضہ لکھ رہا ہوں۔ اگر مر گئے تو معراجِ زندگی، اگر زندہ رہے تو کام کریں گے۔ بہر حال ہم کسی طرح بھی خسارے میں نہیں۔ ہاں خسارے کی صرف ایک صورت ہے کہ نہ مریں اور نہ کام کریں، یعنی گھل گھل کے ہجر یار میں جیتے رہیں۔ یہ صورت بالکل غیر شاعرانہ اور نا قابلِ برداشت ہے۔ بہر حال مجبور انسان رفتارِ فطرت کے سامنے بے بس ہے۔ ان دو چار ماہ میں بہت کام کرنے کا ارادہ تھا اور وہ بھی ٹھوس۔ صرف تقریریں اور باتیں بنانا نہیں۔ مگر قدرت کو اس قدر جلد تبدیلی شاید منظور نہیں۔ دعا کریں ان لمحات میں جبکہ.....''

''میں تقریباً ڈیڑھ ماہ سے بیمار ہوں۔ درمیان میں کچھ طبیعت اچھی ہو گئی تھی کہ اچانک سبی میں ہفتہ عشرہ دماغی الجھنوں کے کام میں مصروف ہونے کے باعث پھر طبیعت گر گئی ہے۔

''میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر اس طرح دماغی کام کرنے کی رفتار جاری رہی تو میرے لیے اپنی صحت کو بچانا مشکل ہو جائے گا''۔

میر مرید حسین نے بھی میر یوسف علی خان کے ''سفر انگلستان'' کی غرض وغایت ''علاج'' ظاہر کی ہے۔ دیگر لوگوں نے بھی اس طرح کی بات کی تھی۔ خود میر یوسف عزیز نے بھی اپنے خطوط میں بیماری کا تذکرہ کرکر کے چیزوں کو اچھا خاصا الجھا دیا تھا۔

بہر حال نواب محمد یوسف علی خان مگسی 9 مارچ کو بمبئی روانہ ہوگیا۔ اور وہ پریس کے لیے یہ بیان چھوڑ گیا۔

''اگر چہ مجھے اس امر کا بھی کافی احساس ہے کہ میری غیر حاضری میں میرے قبیلہ کے مگسی بھائیوں کو قدرے تکلیف ہوگی اور ان تمام معاملات پر کافی اثر پڑے گا جن کے ساتھ میرا تعلق رہا ہے۔ مگر باوجود اس کے مجبور ہوں اور ان وجوہات کی بنا پر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک میری صحت اجازت نہیں دیتی اور میرے علاج کا مکمل کورس ختم نہیں ہوتا، تب تک کسی بھی کام میں حصہ نہ لوں۔ خواہ دماغی اور تخیلی ہو، یا عملی۔ اس لحاظ سے متعلقین اور احباب خیال رکھیں کہ وہ مشورہ یا استصواب رائے کے لیے مجھے میرے ایام علاج کے دوران میں تنگ نہ کریں۔ اور مجھے کچھ عرصہ تک چھوڑ دیں۔(3)

3۔ وطن بدر، وطن پرست

میر یوسف علی خان نے اپنے احباب کو انگریز کی دھمکی آمیز مشورے کا ماجرا سنایا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ جیل جانے سے بہتر ہے کہ وہ کچھ عرصہ جلاوطن رہے۔(4)

چنانچہ 1934 میں اُسے وطن سے باہر بھیج دیا گیا۔ کونج کو اپنی ڈار سے، اپنی سرزمین سے اور، اپنے مشن سے اکھاڑ پھینک دیا گیا۔ اس نے جاتے ہوئے بمبئی سے عنقا کو ایک خط برائے اشاعت ارسال کیا جو اس ہفت روزہ کے آٹھ اپریل کے شمارے میں شائع ہوا:

اہلِ بلوچستان کے نام

نواب یوسف علی خان مگسی بمبئی

''بادہ ہے نیم رس ابھی، شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خُم کے سر پہ تم خشتِ کلیسیا ابھی

''میرے وطن عزیز کے پیارے بھائیو، السلام علیکم!

''میں کامل دو ماہ علاج کرانے کے باوجود شفایاب نہیں ہوسکا۔ لہٰذا مجبوراً یورپ جا رہا ہوں۔ مجھے کافی احساس ہے کہ میری غیر حاضری آپ کے لیے کس قدر ذہنی اذیت کا باعث ہوگی۔ مگر کیا کیا جائے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ایک کی راحت ہزاروں کی مسرتوں کے خون ہی سے تو بنتی ہے۔ ایک شربت کے لیے ہزاروں دواؤں (؟) کا خون کرنا پڑتا ہے۔ اور ساتھ اس کے یہ بھی کہ ہماری نظریں اسی فعل کی ماہیت پا جانے سے ایسے قاصر ہیں جس طرح کہ بلوچستانی ذہنیت کے لیے قربانی کا خاصہ۔

''اس کی تشریح خدائے کریم اپنی الہامی کتاب میں یوں فرماتے ہیں۔۔۔ (ممکن ہے جس چیز کے ساتھ تم محبت کرتے ہو وہ تمھارے لیے نقصان دہ ہو اور ممکن ہے کہ جس چیز سے تم نفرت کرتے ہو وہ تمھارے لیے نفع رساں ہو)''۔

''بس میرے عزیز بھائیو! میں اس احساس کے باوجود کہ تمھیں میرا موجودہ وقت میں چھوڑ کر چلا جانا اچھا نہیں لگے گا، بھی جا رہا ہوں۔ اور یقین رکھتا ہوں کہ قدرت کی ہر حرکت، ہر فعل کوئی نہ کوئی بھلائی اپنے اندر مستور رکھتی ہے''۔

''اور مزید یہ کہ آپ کا بادہ بھی تو نیم رس ہے اور شوق بھی تو اب تک نارسا ہے۔ بس یہی بہتر ہے کہ خُم کے سر پر خشت ہی رہنے دی جائے''۔

تُو جوانِ خام سوزے، سخنم تمام سوزے

غزلے کہ می سرایم، بہ تو سازگار بادا

''یہاں مجھے اپنے لیے اور کچھ عرض کرنا مقصود نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے، جس قدر بھی میرے عزائم کا احاطہ تھا، اس کے مطابق خلوص اور بے غرضی سے قوم و ملک کی خدمت کی، اور اس خدمت کا معاوضہ اگر چاہا بھی تو صرف یہی کہ میرا ضمیر اور میری روحانیت مطمئن رہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ؛

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

اور اگر چند کم نظروں اور ظاہر بینوں کی نگاہ میں میری خدمات کا انعام مجھے سرداری قوم کا انعام اور مجھے اس کام سے مقصود بالذات یہی کچھ تھا تو میں اُن کے جواب میں تو اس کے سوا کچھ عرض نہیں کر سکتا کہ؛

کم نظر بیتابیِ جانم ندید
آشکارم دید و پنہانم ندید

''مگر حقیقت شناس قلوب اور اسرار بین نگاہ والوں سے یہ عرض کروں گا کہ وہ ذرا واقعات کی تہہ میں غور سے جائیں اور سرداری سے ماقبل اور اس کے مابعد کے تمام واقعات اور میری حرکات کو غور سے دیکھنے کے بعد رائے قائم کریں۔ اور اب رفتارِ حال کو بھی دیکھیں کہ کیا ہو رہا ہے، کیا کچھ ہوا اور کیا ہوگا۔ خیر اس قدر بریت اور صفائی کی بھی ضرورت تو نہ تھی مگر صرف اس لیے عرض کیا کہ:

تا تُو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کارے است کہ بے آہ و فغاں نیز کنندہ

''بایں ہمہ میں تمام اہلِ وطن سے معذرت طلب ہوں کہ اگر میری ان خدمات میں کسی بھائی کو میرے ہاتھ سے، قلم اور فعل سے کسی قسم کی جسمانی، ذہنی مادی اذیت یا تکلیف پہنچی ہو تو مجھے معاف فرمادیں کیونکہ بہر حال میری نیت ایسا کرنے کی نہ تھی۔ اگر خدانخواستہ کچھ ایسا ہوا بھی ہوگا تو

نادانستہ اور جوشِ خدمت میں۔۔۔

''اگر زندہ رہا اور صحت جسمانی بھی معاون رہی تو انشا اللہ پھر جلد ہی آپ کے درمیان میں ہوں گا۔ اور آپ یقین رکھیں کہ میں بہر حال آپ کے درد اور آپ کی تکالیف کے احساس سے آزاد نہیں رہ سکوں گا۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

اچھا بھائیو، خدا حافظ۔ خدا کرے میں واپسی پر مناظر دیکھ سکوں گا اور خوش حال، ترقی یافتہ بلوچستان میں قدم رکھ سکوں۔

السلام علیکم

میں 27 ماہ حال لندن روانہ ہو رہا ہوں، پرنم آنکھوں اور خوں ریز دل کے ساتھ.....

آپ کا درد سینے میں دبا کر جانے والا،
یوسف عزیز مگسی بلوچ، از بمبئی
25 مارچ 1934"

***

چنانچہ بقول مرید حسین ''ناموافق حالات اور بیماری کی وجہ سے'' وہ انگلینڈ روانہ ہوا۔(5)

4۔ پیچھے وطن کا حال

''نواب محمد یوسف علی خان مگسی کو سرداری سے معزول کیے جانے کے سلسلے میں یقینی طور پر معلوم ہوا ہے کہ فی الحال چھ ماہ تک سردار محبوب علی خان نواب صاحب کے واپس آنے تک ایک

قائم مقام کے طور پر علاقے کا انتظام کرتے رہیں گے۔ اگر نواب صاحب چھ ماہ تک واپس نہ آئے تو اس عرصہ کو اور بڑھایا جائے گا''۔(6)

مگسی قبائل کی انتظامیہ میر محبوب علی خان کے سپرد تھی جو کہ اُس کا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ ایک نوجوان، مستعد، شریف النفس اور اپنے فرائض پر پورا پورا قابو رکھنے والا انسان تھا۔ اس کی طبیعت میں کافی تحمل، بردباری اور سنجیدگی پائی جاتی تھی۔ اس کی اعلیٰ اہلیتِ کار سے کا کام نہایت خوش اسلوبی سے ہوتا رہا۔ جملہ سردار خیلان مگسی اس کی فرمانبرداری میں اچھا کام کر رہے تھے۔ بقول روزنامہ آزاد، ''بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ علاقہ مگسی اس وقت ایک گوشۂ عافیت ہے جہاں نہ کسی قسم کا شور وشرابہ ہے، نہ کسی قسم کا جھگڑا، فساد۔ اور نہ کسی قسم کے اندرونی مخمصے پائے جاتے ہیں۔ تمام رعایا بڑی شادان، فرحان اپنے جدید اولی الامر کے سایۂ عاطفت میں اپنے رب جلیل کی حد سے زیادہ شکر گزار ہیں''۔

بلوچستان اپنی سیاسی زندگی کی اُس ابتدائی منزل کو طے کر رہا تھا جسے مدتیں ہوئیں ہندوستان کا ہر صوبہ طے کر چکا تھا۔ اور جو حالات اُس وقت اس خطے میں رونما ہو رہے تھے وہ کم وپیش ہر جگہ رونما ہو چکے۔ اور نیز جو حکمتِ عملی بلوچستان کی حکومت نے اختیار کر رکھی ہے اس کا تجربہ ہر صوبہ کی حکومت کر چکی ہے۔ ہندوستان کیا بلکہ دنیا کی سیاسیات ظاہر کرتی ہے کہ ایسے موقعوں پر سخت گیر اور متشددانہ پالیسی آج تک کامیاب نہیں ہوسکی۔ اور حکومتوں کو انجامِ کار پشیمان ہونا پڑا ہے۔ مگر اس قسم کے بے شمار تجربوں اور مشاہدوں کے بعد بھی بلوچستان کی حکومت وہ کچھ کر رہی تھی جو اسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔۔۔ حکومت نے یوسف عزیز کی غیر حاضری میں اُس کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔

8 مئی 1934 صفحہ 8 کا بلوچستانِ جدید لکھتا ہے: ''تازہ اطلاعات مظہر ہیں کہ حکومت کے ارباب بست وکشاد کے جور واستبداد کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ بلوچستان کے مجاہدِ اعظم خان عبدالصمد خان اچکزئی اور ضیغمِ بلوچستان میر عبدالعزیز خان کرد کو سنگین سزائیں دینے کے بعد بھی اُن کے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوسکی۔ اس لیے اب انھوں نے فخرِ بلوچستان نواب محمد

یوسف علی خان تمندار مگسی کو سرداری سے معزول کرنے کی ٹھان لی''۔

سرداروں کی اکثریت انگریز حکمرانوں کے ساتھ تھی (کب نہ رہی!)۔ انگریز کے اِن وفادار سرداروں پر مشتمل ایک بڑا نمک خوار ادارہ قائم تھا جس کا نام تھا: ''کلات سٹیٹ کونسل''۔ چنانچہ ہمیں (8 مئی 1934 کے) اخبار ''بلوچستان جدید'' میں سٹیٹ کونسل کے سامنے پیش کردہ یہ ایجنڈا ملتا ہے۔ آپ اِسی ایجنڈے سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ جمہوریت پسندوں کے سربراہ یوسف کے بارے میں سرداروں اور خان کے عزائم کیا تھے۔

''1۔ جرگہ میں سردار میر محمد یوسف علی خان نے شمولیت نہیں کی۔ کیا وہ سرداری کا اہل ہے۔ (سبی دربار میں اور خان قلات کی رسم تاجپوشی میں شرکت نہ کی)۔

2۔ سردار محمد یوسف علی خان، ہز ہائی نس خانِ قلات سے اجازت حاصل کیے بغیر یورپ چلا گیا ہے، کیا وہ سرداری کا اہل ہے؟''۔

حالاں کہ سردار جانتے تھے کہ مگسی کو کس طرح بیرونِ ملک بھیجا گیا۔ اور دو تین ماہ ہو گئے کہ اس کے علاقے کا نظم ونسق سردار محبوب علی خان کے حوالے تھا۔ بلاشبہ وہ جان بوجھ کر بے خبر تھے۔ اِس سارے معاملے کی ہر تفصیل سرکار کے پاس تھی، سردار جس کا حصہ تھے اور خود نواب مگسی بھی اِس سارے معاملے کی اطلاع باقاعدہ طور پر افسرانِ متعلقہ کو دے چکا تھا۔

اِن انجانوں کو پتہ تھا کہ تمام سرکاری، سرداری اور خان کے اجتماعات وغیرہ میں اس کا قائم مقام حاضر ہوتا رہا ہے۔ ہز ماسٹرز وائس اور کیا ہوتا ہے؟۔ سوال یہ بھی ہے کہ ایسی کسی میٹنگ میں مگسی سردار کا نمائندہ بھی شامل نہ ہوتا تب بھی یہ عدم شرکت کوئی ایسا ناقابلِ عفو جرم ہے، جس کی پاداش میں وہ سرداری سے معزول کیے جانے کا سزاوار ہوسکتا تھا؟

اسی طرح یہ بھی غور طلب بات ہے کہ کیا مگسی سردار، خانِ قلات کا نجی ملازم تھا کہ اُس سے اجازت لے کر جاتا؟۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ تو خانِ کلات کے بھی آقا یعنی انگریز کے مقرر کردہ پولیٹکل ایجنٹ کلات اور وزیراعظم کے ''مشورے'' سے ''بغرضِ علاج'' لندن گیا تھا۔

سچی بات یہ ہے کہ سٹیٹ کونسل کے سامنے موجود سوالات اپنے اندر ہی جواب لیے

ہوئے تھے۔ بھیڑیا خواہ بہاؤ کے اوپر ہو تب بھی وہ بھیڑ کے بچے پر ہی پانی گدلا کرنے کا الزام لگاتا ہے۔ زور آور دلیل اور جواز کا محتاج نہیں ہوتا۔ چنانچہ انہی دو بھدے الزامات کو بنیاد بنا کر ''سٹیٹ کونسل نے فیصلہ صادر فرمایا کہ سردار محمد یوسف علی خان سرداری کے اہل نہیں''۔ چل چُھی۔

حکمران طبقات متبادل کا پہلے ہی انتظام کر چکے تھے۔ (اِن کا ہوم ورک کبھی نامکمل نہیں رہتا)۔ چنانچہ سٹیٹ کونسل کے حکم کے اگلے دو فقرے یہ تھے: ''اس کو ہٹا کر سردار گل محمد سابق معزول شدہ سردار کو دوبارہ سردار بنایا جائے۔'' کیوں؟۔۔۔ ہاہاہا۔ اس لیے کہ، ''پچھلی دفعہ سردار گل محمد کو بلاقصور سرداری سے ہٹا دیا گیا تھا۔'' ہت تیری!۔ دیکھا؟! انگریز اپنا ضرب المثل خوب جانتا تھا کہ: When cat is away the mice will play۔ حربہ کامیاب۔

سرداروں کے طبقاتی مفاد کے قلعے میں تو یوسف کا نعرۂ مستانہ پہلے ہی بلوچی تھیریم حجم کے شگاف ڈال چکا تھا۔ سرداریت کا ذبح ہونا تو پوری ڈیڑھ صدی کے بعد اب بھی حسرت ہی ہے۔ لیکن وہاں اُس نظام کو بہرحال سر میں یوسفی ڈنڈا لگ چکا تھا۔

چنانچہ مگسی کی طرف سے اپنے قبیلے کے اندر زبردست حسنِ انتظام اور سکون و آرام اور رعایا کی خوشی خوش حالی کے سماج کے قیام کے جرم میں فیوڈل و سردار طبقہ موقع کی تاڑ میں تھا۔ ترازو میں عوام کا پلڑا بھاری ہو تو سمجھو مراعات یافتگی ہوا میں!!۔ چنانچہ یوسف علی خان انگلینڈ کیا گیا کہ جملہ سردارانِ قلات بہ یک آہنگ اس قدر مشتعل اور پُرخوں ہو کر سامنے آئے کہ وہ نواب یوسف علی خان کو سرداری سے علیحدہ اور معزولی کرنے کے مشورے اور پروپیگنڈا زور شور سے کرنے لگے۔ تمن مگسی میں اس اقدام سے ایک زبردست ہیجان پیدا ہو رہا تھا۔ مگسی قبیلہ کسی طرح سے بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ نواب یوسف علی خان کو سرداری سے بر طرف کر کے کسی نئے سردار کا انتخاب عمل میں لایا جائے۔ سرداروں کا سردار اور خانوں کا خان ''حضور ہز ہائی نس والئی قلات'' بھی ان سرداروں کے مشوروں سے متفق تھا۔ چنانچہ

سردارانِ کلات اور والئی کلات کی طرف سے چار افراد (ارباب کرم خان اسسٹنٹ وزیراعظم، خان محمود خان ای اے سی، وڈیرہ سردار نور محمد بنگل زئی، سردار رسول بخش مینگل) پر مشتمل ایک گروپ 26 اپریل 1934 کو جھل پہنچا۔ اُس سے ذرا پہلے کوئٹہ میں لطف علی خان نندائی افسر مال جھل نے حسین بخش مگسی اور میر امیر جان مگسی کو بلا کر انھیں خوف و لالچ دے کر اُن سے نواب یوسف علی خان کے خلاف دستخط لے لیے۔ اور بعد میں دوسرے مقدمین و معتبرین سے دستخط لینے اور انھیں سٹیٹ کونسل کی رائے سے متفق کرنے کے لیے ان چار آدمیوں کا گروپ جھل پہنچا۔ 27 اپریل کو جملہ مقدمین مگسی اور ان چار آدمیوں کے گروپ کے مابین ایک طویل بحث ہوئی۔ بالآخر تمام مقدمین، معتبرین اور سردار خیلانِ مگسی نے بڑی جرح قدح کے بعد اپنے سردار کے خلاف دستخط دینے سے صاف انکار کر دیا۔ (27 اپریل اب تک اچھا دن ثابت ہوتا رہا ہے)۔

مقدمین مگسی نے کہا کہ سردار یوسف علی خان کے عہد سرداری میں آج تک ہمارا کوئی مقدمہ یا کوئی مثل کسی افسر بالا کے دفتر میں نہیں گیا۔ اُلٹا سابق سردار گل محمد کے وقت سے جو فائلیں پی اے قلات کے دفتر میں فیصلہ کے لیے رکھیں تھیں، وہ بھی واپس ہمارے ہاں فیصلے کے لیے آ رہی ہیں۔ ہمارے علاقہ میں ہر طرح کا امن و امان ہے، بچہ بوڑھا تک تمام آبادی امن آشتی کی زندگی گزار رہی ہے۔ یہ کیا ظلم ہے کہ باوجود امن و آرام اور راحت و سکون ہمارے سردار کو معزول کیا جا رہا ہے۔ ہمارا سردار چھ ماہ کے لیے معالجہ کی غرض سے ولایت گیا ہوا ہے، واپس آئے گا۔ ہمیں ہر گز دوسرے کی سرداری منظور نہیں ہے۔ (7)

مگر انگریز جانتا تھا کہ میلہ اب ختم کرنا ہے۔ مگسی اور اس کی بلوچ کانفرنس ایک مستقل و مسلسل کانٹا ہے جو اُس کی سامراجیت اور فیوڈل سرداروں کے گلے میں اٹکی ہوئی ہے۔ سامراج کو لوٹ چاہیے ہوتی ہے اور سردار کو اس عمل میں حصہ۔ بدامنی، بے چینی، خوف اور لالچ کی فضا سخت ہو تو زیادہ سر جھکنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اِس سردار کی رعایا اپنے سردار سے بہت خوش تھی، امن و امان میں تھی۔ اور علاقہ میں بھی کسی قسم کا بیرونی و اندرونی خطرہ یا فتنہ و فساد نہ تھا۔ تو یہ سب کچھ پورے سرداری نظام کے لیے بڑا خطرہ تھا۔ علاج؟۔ علاج یہ کہ اس سردار کی رعایا کے

جذبات کا خون کر کے اس سردار کی معزولی کی جائے ۔ یوں سارے تمن میں ایک قسم کا اشتعال یا جوش پیدا ہوگا ۔ اور اپنی ہر ناتمام سعی کو اس پر ختم کر ڈالا جائے کہ کسی نہ کسی طرح سے قوم سردار کے خلاف ہو جائے ۔

مذکورہ بالا اخبار ہمیں بتاتا ہے کہ ارباب کرم خان اسسٹنٹ وزیراعظم نے گنداواہ پہنچ کر وہاں سے آرڈر بھیجا کہ ہمارے جَھل پہنچنے سے پہلے پہلے میر محبوب علی خان جھل سے باہر نکل جائے ، اور فوراً کوئٹہ پہنچے ۔ تاکہ اُس کی موجودگی قوم مگسی کو اپنے سردار کی مخالفت کرنے کے سلسلے پر اثر انداز نہ ہو سکے ۔ اس وقت میر محبوب علی خان مع معتبران اعتبار خان، سمیڑ خان، عظیم خان، شکر خان، گاجن خان، لعل بخش خان، بلوچ خان، امیر جان خان، گوہر خان مستونگ بلائے گئے ۔ جاتے وقت یہ تمام معتبرین اپنے بچوں تک کو ہدایت کر گئے ہیں کہ خبردار اپنے عزیز اور محبوب سردار سے بے وفائی نہ کرنا ۔ بلکہ ضرورت پڑے تو اُس کے لیے قید ہو جاؤ، پھانسی پر لٹک جاؤ، مارے جاؤ (8) ۔ انھیں خدشہ تھا کہ، شاید ان معتبرین کو وہاں دوسرے سردار کے انتخاب کو عمل میں نہ لانے کی پاداش میں قید رکھا جائے گا ۔

حکومت نے جام نوراللہ خان کو علاقہ مگسی کا انچارج کر کے بھیج دیا ۔

یوسف کو سب باتوں کی خبر ہوتی رہی ۔ وہ واپس آیا تو یہ ساری کایا پلٹ ہو چکی تھی ۔ اس نے امین کھوسہ کو ایک خط میں یوں کہا؛

''جام صاحب کے چارج لینے کے بعد بندہ آج کل فارغ زندگی بسر کر رہا ہے ۔ سوائے ایک چھوٹے سے باغ میں کام کرنے اور درختوں کی دیکھ بھال کرنے کے، تقریباً فارغ ہوں ۔ مگسی اسے محسوس کر رہے ہیں، مگر میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ۔

''جو کچھ ہوا ہے، واقعات کی اپنی رفتار ہے ۔ میں جَھل کے لیے یہ کچھ نہیں چاہتا تھا جس طرح کہ ہو رہا ہے ۔ بلکہ میرا ذاتی ششم حصہ بھی گورنمنٹ کے زیر انتظام ہے ۔ اور طرہ یہ کہ سب کو الاؤنس مل رہا ہے ۔ مجھے اس سے بھی محروم رکھا گیا ہے ۔ خیر بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا علاج نہیں ہو سکتا ۔ جام نوراللہ بذاتہ میرے مہربان ہیں ۔ مگر پھر بھی ان کی موجودہ ذمہ

داری بحیثیت گورنمنٹ افسر ہے جس کے برخلاف یوسف اس وقت تک لڑتا رہا ۔ مگر قوم کے حالات نے قدرے شکستہ دل بنا رکھا ہے ۔ جب تک جَھل میں ہوں، میرا مرکزِ توجہ جامعہ کے بچے اور باغبانی ہے ۔ ۔ ۔

''محبوب نے بھی سرداری سے استعفا دے دیا ہے ۔ اب جَھل کا کوئی سردار نہیں ۔ مالی اور سیاسی امورات سب جام کے ہاتھ میں ہیں ۔ اس وقت تک اچھا کامیاب رہا ہے، آگے کون جانے ۔''

اُسے ایک اور خط میں اس نے لکھا: ''سرداری کے بارِ گراں سے تو سبکدوش ہوا، اب گزارہ بھی تو آخر کرنا ہے ۔ ۔ ۔ خانِ کلات نے اپریل کے بعد بیس دن کلات میں آ کر ان کے پاس رہنے کی دعوت دی ہے ۔ کاش کہ آپ بھی چلتے ۔ اُن کے پاس سیاست لڑانے تھوڑا ہی جائیں گے ۔ یہ صرف ایک آزاد وقت تفریح میں گزارا جائے گا'' ۔

''کیا آپ نہیں سمجھتے تھے کہ مجھے سرداری پھر حاصل کرنے کی کس قدر تمنا تھی اور میں ٹھوس، عملی خدمت کے اس موقع کو پھر سے حاصل کرنے کے لیے کس قدر مضطرب تھا ۔ بایں ہمہ حالات و واقعات اور حکومت کے اربابِ اقتدار کے انداز و اطوار کو جانچ کر اس کے مطابق کوشش بروئے کار لانا، یہ سب چیزیں ایسی تھیں کہ اگر اس جذبے کے حاصل کرنے کی تمنائیں نظر انداز کی جاتیں تو وہی بات ہوتی: ''بات بھی کھوئی التجا کر کے'' ۔

چنانچہ وہ ساری تحریک جو کرد، اچکزئی اور مگسی کی گرفتاریوں، مالی قربانیوں اور جسمانی تگ و دو سے اچھی خاصی قد آور درخت بن چکی تھی ایک بار پھر طبقاتی معروض کی پینترے بازیوں کی نذر ہو گئی ۔ ۔ ۔ ابھی بلوچ معاشرہ ردعمل کی پوزیشن ہی میں نہ تھا ۔ بلکہ مگسی کی سرحدوں سے پرے مکران اور وڈیرہ جات کو معلوم تک نہ تھا کہ جَھل کیا انقلابی کروٹیں لے رہا تھا ۔ اس لیے بلوچ عوام اپنی بے خبری میں جَھل سے کوئی یک جہتی نہ دکھا سکے ۔ جبکہ طبقاتی دشمن یعنی سندھ و ہند کا سردار اکٹھے ہو کر بلوچ قوم اور جمہوری تحریک پہ پل پڑا تھا ۔

اُس کے بعد بلوچستان کے بارانی نالوں کی طرح یہ پارٹی بھی دوبارہ اگنے کے لیے فوت ہو گئی ۔ آگے نمودار ہونے کے لیے اس نے نام وغیرہ بدلنے تھے ۔ ایک حل تو یہ نکالا گیا کہ، انجمن

اتحادِ بلوچستان کو دوبارہ متحرک کیا جائے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ انجمن، درمیان کے بلوچ کانفرنس کے دو تین سال چھوڑ کے ہر سال اپنے سالانہ سیشن منعقد کیا کرتی تھی۔ اب چوں کہ 1934 میں آل انڈیا بلوچ کانفرنس تتر بتر کردی گئی۔ یعنی اس کا وجود ہی غائب ہوگیا تھا، تو سالانہ جلسے کے لیے انجمن کے ارکان سے اپیل کی گئی:

''۔۔۔ میں آج بلوچستان کے غیور وطن پرست فرزندوں کو نہایت زور کے ساتھ اپیل کرتا ہوں کہ اِس سال شاید بلوچستان اینڈ آل انڈیا بلوچ کانفرنس کا سالانہ جلسہ منعقد نہ ہو۔ میں انجمن اتحادِ بلوچستان کے جملہ اراکین وممبران کی توجہ اس امر کی طرف جلب کرنا چاہتا ہوں کہ اس آنے والی کرسمس تعطیلات میں وہ انجمن کے پندرھویں سالانہ جلسہ کے انعقاد کی تیاری کریں''۔ (9)

اگلی بات ''ینگ بلوچستان'' کے 16 اکتوبر 1934 کا شمارہ یوں بتاتا ہے:

''سرکاری حلقوں میں یہ خبر بہت زوروں سے گشت لگا رہی ہے کہ ظاہراً سر میر شمس شاہ نیابت کی وزارت سے بیزاری کا اظہار کررہے ہیں۔ لیکن در پردہ اُن کی انتہائی کوششیں اس بات پر صرف ہورہی ہیں کہ ان کو دوبارہ ریاست کی عنانِ وزارت سپرد کردی جائے۔

''واضح رہے کہ اُس وقت اچکزئی اور کرد کے علاوہ نواب یوسف علی خان عزیز مگسی بھی برطانوی حکومت کے ظلم واستبداد کا شکار تھے۔ دردمند محنتی جوان بہت بیدار مغز روشن خیال عزیز مگسی نے بلوچستان میں سیاسی بیداری کے سلسلے میں بے حد مقبولیت حاصل کی تھی۔ یورپ میں علاج کے لیے دس ماہ قیام کے بعد جب وہ بلوچستان واپس لوٹا تو برطانوی حکومت ڈر گئی کہ کہیں وہ واپسی پر اس رجعت پسندانہ نظام کے خلاف آواز بلند نہ کرے۔ چنانچہ حکومت نے یہ حکم جاری کردیا کہ وہ تین سال تک اپنے علاقے یوسف آباد میں رہے گا اور پولیٹیکل ایجنٹ کی اجازت کے بغیر باہر نہ نکلے گا۔ وہ برطانوی ہند کے کسی سیاسی اور اندرونی اور بیرونی سیاست سے بے تعلق رہے وگرنہ اسے نوابی سے معزول کردیا جائے گا''۔

اخبار نے چیف کمشنر سے سوال کیا کہ ان کے پاس نواب کے خلاف کیا مواد موجود ہے۔

وہ مارکسی نہیں، احرار نہیں، اشتراکی نہیں، انقلابی نہیں تو پھر حکومت ان پر پابندیاں کیوں عائد کررہی ہے۔ اگر نواب اپنے علاقے کے باشندوں کی تعلیمی اور معاشرتی ترقی کے لیے کوشاں ہے تو یہ کوئی جرم نہیں جس کی پاداش میں اس بے نظیر مصلح قوم کو دہشت گردوں کی طرح نظر بند کررہی ہے۔ اخبار نے چیف کمشنر کو کہا کہ وہ نواب صاحب کے خلاف اس قسم کا متعصّبانہ اور شرمناک رویہ اختیار کرنے سے اجتناب کرے۔

اور دانا انہیں سمجھاتا رہا، دانا ہمیں سمجھاتا رہتا ہے کہ:

''۔۔۔ اور جو حضرات یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ عبدالصمد یا یوسف وغیرہ کو کان میں کوئی مخصوص ملک کہتا ہے اور وہ رقص میں آکر آپے سے باہر ہوکر اصلاحات اصلاحات پکارتے ہیں۔ ایسے حضرات بھی شکریہ کے مستحق! لیکن ہم لوگوں کو ایسے نظریہ سے ذرہ اتفاق نہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ عبدالصمد کا وجد میں آنا اور یوسف پر حال کا حاوی ہونا صرف ان چند نفوس تک محدود نہیں۔

''حقیقت یہ ہے کہ کسی ملک کے درد والم کی ایک پکار ہوتی ہے جو یوسفؔ کی صورت پکڑ لیتی ہے۔ یا کسی رسم ورواج سے خونخوار زخم کھائے ہوئے معصوم دوشیزہ کے آنسو ہوتے ہیں جو کسی امینؔ کے قلم سے ٹپک پڑتے ہیں۔ یا ہزاروں بے گناہ مظلوم لوگوں کی صدائیں ہوتی ہیں جو کسی کردؔ کی تحریروں اور تقریروں کا جوش بن جاتی ہیں۔۔۔''(10)

5۔ لندن سرگرمیاں

نواب محمد یوسف علی خان مگسی لندن سے اپنے ایک دوست کو لکھتا ہے کہ اُس کی صحت اب کافی اچھی ہوچکی ہے۔ اس کا وزن کافی بڑھ گیا ہے، اور بڑھتا جارہا ہے۔ وہ انگریزی تعلیم بھی حاصل کررہا ہے اور اپنی تعلیم میں اس قدر اچھا ہے کہ اس کے استاد نے اس کو ''مسٹر فلاسوفر'' کا خطاب دے رکھا ہے۔(11)۔ کاش کہ اس کے لندن قیام کے بارے میں ہمارے پاس مزید

معلومات ہوتیں۔اس لیے کہ دیگر چیزیں پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ لندن نے اُس کے شعوری ارتقا میں زبردست اثرات ڈالے۔مزدوروں،محکوموں اور عورتوں کے بارے میں اس کا تصور بہت وسیع ہوا۔ فیوڈل نظام کی اندھیر اُسے بہت واضح نظر آنے لگی۔محبت اور جدوجہد کے بارے میں اُس کی فکر بہت فوکس ہوگئی۔مگر اِن حسین تبدیلیوں میں کن کن عناصر نے اس کی راہنمائی کی،تفصیل سے معلوم نہیں ہے۔کاش ہمارے نوجوان ریسرچرز یہ چیپٹر کھوج نکالیں۔

ریفرنسز

1۔ہفت روزہ ''بلوچستان جدید'' کراچی۔یکم مارچ1934

2۔تاج محمد ڈومبکی کے نام خط۔یوسف مگسی کے خطوط۔مگسی چیئر یونیورسٹی آف بلوچستان۔صفحہ 16

3۔ہفت روزہ بلوچستان جدید۔16 مارچ1934۔صفحہ 9

4۔مصنف نامعلوم۔فریادِ بلوچستان۔ہفت روزہ لیل ونہار کراچی۔21 جون1970۔صفحہ 13-14

5۔مرید حسین۔۔صفحہ 55

6۔بلوچستانِ جدید۔یکم جون 1934۔صفحہ 6

7۔بلوچستان جدید،8 مئی1934

8۔نجات،کراچی۔4 مئی35

9۔محمد حسین عنقا۔سہ روزہ ''ینگ بلوچستان''۔20 نومبر1934

10۔کھوسہ،محمد امین۔بلوچستان کے حالات پر ایک تبصرہ ہفت روزہ بلوچستان جدید۔یکم جون1934

11۔بلوچستان جدید۔16 جون1934۔صفحہ 11

آٹھواں چیپٹر

لندن سے واپسی

میر یوسف علی خان ایک سال لندن میں جلاوطن رہنے کے بعد 31 جنوری 1935 کو لندن سے واپس کراچی پہنچا۔ وہاں سے وہ سکھر گیا اور پھر وہاں سے ڈھاڈر گیا اور ایک ہفتہ تک خان احمد یار خان کے ساتھ رہا۔

مولانا ظفر علی خان کو بلوچستان کی سیاسی تحریک سے والہانہ لگاؤ تھا۔ اپنی ایک نظم میں انگلستان سے یوسف علی خان کی وطن واپسی پر اہلِ بلوچستان کو خلوص دل سے مبارک باد دی۔ نظم کا عنوان ہے؛ ''یوسفِ طرح دار آ گیا۔''(1)

یوسف علی خان کوئٹہ کے توغی روڈ پہ واقع ''مدرستہ البنات'' چلا گیا۔ مدرسہ کا مہتمم عبیداللہ بلوچ مگسی صاحب کا بہت عقیدت مند تھا۔ اس مدرسے کی بچیوں نے مولانا ظفر علی خان کے اِن اشعار سے مگسی صاحب کا خیر مقدم کیا:

مبارک ہو یوسف علی خاں کی آمد
گلستان میں فصلِ بہاراں کی آمد
گل و لالہ و ارغواں کو مبارک

برستے ہوئے ابرِ نیساں کی آمد
بلوچوں کو کہہ دو کہ ڈالے گی ہل چل
شغالوں میں شیرِ نیستاں کی آمد

آپ نے واپسی پر ''سیاسیات مقدم ہے یا اقتصادیات'' کے عنوان سے ایک زوردار مضمون لکھا جس میں اپنے خیالات اس طرح پیش کیے۔

''وہ اشخاص جو دو وقت کی روٹی پیٹ بھر کر کھانے کی استطاعت رکھتے ہیں، کیا انگلیوں پر نہیں گنے جاسکتے؟۔ ہمارے دیہات کی منتشر آبادی، جن کو نہ سونے کا ڈھنگ ہے، نہ کھانے کی تمیز اور پھر سردار پرستی، بیماریوں سے بھرے ہوئے اور غلیظ گھروں اور سال ہا سال کے پرانے کپڑوں کا، جو جراثیم کا آشیاں بنے ہوئے ہیں، استعمال دردناک نہیں؟''(2)

کمال لوگ تھے یہ۔ خود ساختہ، خود ڈسپلنڈ اور پہل کاری کرنے والے لوگ!!۔

ریفرنسز

1۔ مولانا، ظفر علی خان۔ نگارستان۔ صفحہ 173
2۔ کوثر، انعام الحق۔ نقوشِ بلوچستان۔ 2005۔ ادارۂ تصنیف و تحقیق بلوچستان۔ صفحہ نمبر 157

نواں چیپٹر

زلزلہ، زلزالہا

وہ کوئٹہ میں سرکاری ڈاک بنگلے میں اقامت گزیں تھا (1) کہ 30اور 31 مئی1935 کی درمیانی شب3بج کر5منٹ کو وادی کوئٹہ،مستونگ اور قلات کا ہولناک زلزلہ ہوگیا۔ یہ بہت ہی ہولناک زلزلہ تھا۔

مولانا ظفر علی خان کو اس زلزلے کی اطلاع ملی اور یہ جھوٹی خبر بھی کہ یوسف عزیز مگسی اِس زلزلہ میں بچ گیا۔مولانا نے فوراً ہی ''بلوچستان'' کے عنوان سے مندرجہ ذیل شاعری تخلیق کی۔(2)

نہ بھولے گا بلوچستان کا بھونچال یاروں کو
قیامت تھا ہر ایک بستی میں اُس کا شور مچ جانا
اترنا اس کی ہیبت کا دلوں میں اور دماغوں میں
سراپاؤں کے ریشہ ریشہ اور نخ نخ میں رچ جانا
تماشا گاہِ عبرت تھا قضا کے زورِ بازو کا
جہانِ ناتواں کی نیم جانی سے پلچ جانا

جسے ہم مارنا چاہیں بچا سکتا ہے کون اس کو
اس ارشادِ خداوندی کو منکر نے بھی سچ مانا
خدا کا سایہ ہو یوسف علی خان کی طرح سر پر
تو آساں ہے فنا کی زد میں آنا اور بچ جانا

مگر وہ خبر سچ نہ تھی۔ ہمارا محبوب لیڈر اور استاد میر یوسف علی عزیز مگسی بھی اس زلزلے میں نگلا گیا۔ اُس کی عمر اُس وقت محض 27 برس تھی۔

آج یہ بات کوئی جانتا تک نہیں کہ مگسی صاحب کو ایذائیں دینے والے فرعون صفت وزیراعظم، خان بہادر نواب میر شمس شاہ (1918-1935) بھی اسی زلزلے کی نذر ہو گیا تھا۔ اور یہ بھی کوئی نہیں جانتا کہ تکبر و جلال بھرا یہ ظالم حکمران کوئٹہ کے ریلوے سوسائٹی کے قبرستان میں دفن ہے۔

یوسف عزیز کی موت تو پوری تحریک کا سکتہ تھی۔ یوسف عزیز مگسی کی صورت میں ایک مردِ قلندر مر گیا اور بہت پہلے ایک زبردست بات کر گیا؛ ''اگر مر گئے تو معراجِ زندگی اور اگر زندہ رہے تو کام کریں گے، ہم کسی طرح بھی خسارے میں نہیں۔ ہاں خسارے کی صرف ایک صورت ہے کہ نہ مریں اور نہ کام کریں''۔

میر گل خان نصیر نے یوسف عزیز کی زلزلہ میں شہادت پر لکھا تھا:

''وہ کون سا دل ہے جس میں نوجوان یوسف کی ناگہانی موت کا سن کر رنج والم کے بادل نہ امڈ آئے ہوں۔ وہ کون سی آنکھ ہے جو بلوچستان کے اس مایہ ناز فرزند کی یاد میں خون کے آنسو نہیں بہاتی ہو۔ یوسف، ہم گم کردہ راہ بلوچستانیوں کے لیے خضر کی طرح نمودار ہوا اور بھولے بھٹکے بلوچستانیوں کو راستے پر لگا کر یکا یک غائب ہو گیا۔ یوسف کو خداوند نے مسیحائے بلوچستان بنا کر بھیجا جو مردہ بلوچستانیوں میں حیاتِ جاوید پھونک کر خود آسمان کی جانب پرواز کر گیا''۔

مرید حسین مگسی نے دنیاوی اعتبار سے تو بالکل صحیح لکھا کہ؛ ''سردار یوسف علی خان کی کوئی

اولاد نہ تھی''(3)۔

میں آدھا فقرہ لکھ کر اپنے پڑھنے والے سے اس فقرے کا جواب دینے کی فرمائش کرتا ہوں:

''کیا واقعی اُس کی کوئی اولاد نہ تھی؟''

ریفرنسز

1۔ پناہ، ملک۔ ''بلوچستان کے اولین عوامی اور سیاسی رہنما''۔ نوکیں دور۔ یکم جون 1971۔ صفحہ نمبر 4

2۔ مولانا، ظفر علی خان۔ 4 جون 1935۔ مجموعہ کلام: ''نگارستان''۔ صفحہ 141

3۔ مگسی، مرید حسین خان۔ تاریخ مگسی قبائل۔ صفحہ 55

دسواں چیپٹر

برمزارِ ماغریباں.....

میر یوسف علی خان کوئٹہ کے کاسی قبرستان میں مدفون ہے۔اس کی ہمشیرہ نے اس کی زیارت کوخوبصورت سفید سنگ مرمر سے بنوایا تھا۔اردگرد لوہے کا خوش نما جنگلہ تھا۔مقبرے پر سنگِ مرمر کا تعویذ بنادیا گیا۔اُس تعویذ پر یوسف ہی کے اشعار کندہ کرائے گئے:

کہاں ہے قوتِ حق اور کہاں مروتِ خلق
سناکے تھک گئے ہم تو یہ حالِ زار اپنا
عزیزؔ موت کا جب ایک دن معین ہے
مجاہدوں میں کرائیں نہ کیوں شمار اپنا

مگر آج زیارت کی حالت اچھی نہیں ہے۔ہم اس سلسلے میں بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ ہم اُستاد والے ہیں۔بے کار رونا پیٹنا، دوسروں کو دوش دیتے رہنا، اور ہر وقت یاس ونا امیدی پھیلاتے رہنا نامراد روحوں کی شناخت ہیں۔ہم تو محمد امین کھوسہ کے الفاظ دوہراتے رہتے ہیں۔

''مرا تو شہید ہو کر مرا.....اور اس قبر میں زندہِ جاوید روح و بدن کی پیوستگی جس نے نہ دیکھی اُس نے دیکھا ہی کچھ نہیں.....ایسی قبروں کو شکستہ لکھنے والے خود شکستہ آنکھیں رکھتے ہیں اور 'شکستہ دل' سے محروم ہیں۔''(1)

ریفرنسز

1۔کھوسہ، محمد امین۔نصرت کراچی۔عزیز مگسی نمبر۔5 جون 1957

عطا شاد

''ہست و ناہست کی قہر بادِ مسافت میں اُمید گر کیسے زندہ رہے؟تم نے جانا؟!''

ضمیمہ نمبر 1

خراج ہائے عقیدت

میر گل خان نصیر نے اسے یہ مظلوم خراج پیش کیا:

رہبرے کامل یلِ یوسف عزیز
باوفا و با کمال و با تمیز
در دلِ ما تخمِ آزادی نشاند
وائے یوسف رفت تخم او بماند
خونِ مارا فطرتِ سیماب داد
نوجوانان را دلِ بے تاب داد
رفت یوسف نامِ او باقی ہنوز
درخمستانِ وطن ساقی ہنوز

ایک اور جگہ میر گل خان ''بوفاتِ نواب میر یوسف علی خان مرحوم'' کے عنوان کے تحت

میر یوسف عزیز مگسی کی موت کا نوحہ یوں پیٹتا ہے:

ارادہ تھا کہ اک دنیا نئی آباد کر لیں گے
عدو کے ہاتھ سے ہم ملک کو آزاد کر لیں گے
اکھاڑیں گے بلوچستان سے ہم بیخ باطل کی
وطن کے دشمنوں کو یک قلم برباد کر لیں گے
مٹا ڈالیں گے جرگہ کی یہ ایماں سوز رودادیں
شریعت سے مسلمانوں کو پھر دلشاد کر لیں گے
اٹھا دیں گے بلوچوں کو پھر اس خاکِ مذلت سے
ثریا پر ہم ان کا آشیاں آباد کر لیں گے
مٹا دیں گے لب و ولور کے جھگڑے ملک سے یکسر
پرانی بدعتوں سے ملک کو آزاد کر لیں گے
مگر اے بختِ بد تو نے کہیں کا بھی نہیں رکھا
تیرے ہاتھوں سے روزِ حشر تک فریاد کر لیں گے
نہیں بھولے گی تیری یاد اے یوسف علی ہم کو
رہے گی زندگی جب تک تمہیں ہم یاد کر لیں گے

***

عبدالرحمٰن غور

رہی ہے مصلحت اندیش کب تیری آواز
کسی طرح بھی دبی کل، نہ اب تیری آواز
اٹھی تو نعرہِ منصور کی طرح گونجی
ہے ظلمتوں میں نویدِ طرب تیری آواز
ترا قلم ترے افکار زندگی کے نقیب

عروجِ فکر و نظر کا سبب تیری آواز
کبھی پنپ نہ سکے گی سیاستِ پرویز
شکارِ وعدہِ شیریں ہے کب تیری آواز
رواں ہے سینہ بہ سینہ یونہی نفس بہ نفس
مثالِ نغمہِ دل لب بہ لب تیری آواز
وہ خاموشی کے ہوں پہرے کہ گوشہِ زنداں
رہی فغانِ سحر، آہِ شب تیری آواز
فضا میں پھیل گئی موجہِ صبا کی طرح
لبِ حیات پہ گونجی ہے جب تیری آواز

***

احسان بن دانش

زندگانی جس سے تھی گلستاں درکنار
وہ مرا یوسف ، وہ رشکِ ماہ کنعاں کیا ہوا؟
خون روتے ہیں سبھی ارکانِ تعمیر ادب کیا ہوا
جانِ ادب، یوسف علی خاں کیا ہوا

***

بابو عبدالکریم شورش

براہیت لکھ سلاماں پر تو یوسف

بلوچستان زہیرانت پر تو یوسف
کہ جہ جنگ بلوچستاں مروچی
گوں شان وشرف دروتاں بلوچی
بلوچستانئے اے پھلیں دریائیں
مدام زندگ تئی نام و تواریں
بیا اِت شورشئے ہمدم و بیلاں
بزور ات بیرک شان بلوچستان

محمد حسین عنقا

کُجا رفتی کجا یوسف علی خانؒ
بگو بہرے خدا یوسف علی خانؒ
تو بودی رونقِ کاشانۂ ما
برون رفتی چرا یوسف علی خان
مگر حسِ تو نتوانست دیدن
سالِ زلزلہ یوسف علی خانؒ

تو یا از لغزشِ ما رنج کردی
کہ مے رفتی زِما یوسف علی خان
ترا یا خوش نیامد بزم بے جان
کہ میگشتی جدا یوسف علی خانؒ
گسستہ از چہ از گُردو اچکزی

تومے رفتی خفا یوسف علی خان

چرا شد این ہمہ آخر چرا شد
بگو بہرے خدا یوسف علی خانؒ
ترا خُو بود، لطف و رحم کردن
چرا کردی جفا یوسف علی خان
چرا برما فزودی رنج و غم ہا
تو بودی غم رُبا یوسف علی خان
برائے قوم بودی وقف اکنوں
گریزانی چرا؟ یوسف علی خان
نمی شد گر وفا ز قوم خستہ
تو می کردی وفا یوسف علی خان
چہ شد آخر کہ می کردی فَراموش
تو قومِ خستہ را یوسف علی خان
ہما مائیم و ملکِ ما ہمان است
ہما احوالِ ما یوسف علی خان
ہما خونریزی و دختر فروشی
رواجِ خون بہا یوسف علی خان
ہما بے شرع و آئین جرگہ رائج
رواجِ بد نما یوسف علی خان
ہما ملعون زنجیرِ غلامی
بدست و پائے ما یوسف علی خان

ہما انگریز بیجا اقتِ اُرش
ہما فرمان روا یوسف علی خانؒ
ہما سردار، رواجی
ہلاکو خان بما یوسف علی خان
ہما خون میخورد سرمایہ داری
زِ جَان روستا یوسف علی خان
ہما قومِ تو از افلاس و تنگی
بہ فاقہ مبتلا یوسف علی خان
ہما جہل و ہما نااِتفاقی
نصیبِ شوم ما یوسف علی خان
چرا داری لبِ خاموش آخر
بزن حرفے بما یوسف علی خان
شنیدستی تو چیزے از ملائک
نویدِ جانفزا یوسف علی خان
رہا گشتند ہان کُرد و اچکزئی
زِ زِندانِ بلا یوسف علی خان
درِ مسدود اخبار و جماعت
چوہندی گشتہ وا یوسف علی خان
مگر سرزد تشتت در جماعت
بیا بہرِ خدا یوسف علی خان
دِگرتا جان در آید در جماعت
میانِ ما بیا یوسف علی خان

دِگر بالیدگی ارزاں بفرما
نہالِ قوم را یوسف علی خان
دِگر قربان کن از بہرِ مِلّت
بہشتی حور را یوسف علی خان
عزیز از جَان بہ عنقا بخش ہمت
زِ جنت باز آ یوسف علی خانؒ

***

میر شیر علی خان بنگلزئی

رہتی ہیں آنکھیں اشکبار
دل سے نکلتے ہیں شرار
ہے جان و تن بھی بے قرار
تجھ بن کہاں دل کو قرار
اے یوسفِ عالی مقام
منظور جملہ خاص و عام
بلبل میانِ مرغزار
کرتا ہے گریہ زار زار
کوکو کناں قمری فگار
کیسا خزان کیسی بہار
اب تھا بہار اور اب خزاں
ایسے نہیں کامِ جہاں

گلشن سے گلچینِ اجل
چن کر گلابِ باعمل
کر لی ہے دنیا مضمحل
پتھر بھی گریاں در جبل
یوسفؔ تیری اس موت سے
افسوس تیری موت سے
میں کیا کروں رب سے دعا
تیرے جو کام ہیں برملا
بخشا ہے تجھ کو خود خدا
جنت میں ماوائے ہے ترا
جانِ بلوچستانیاں
اے یوسفِ جنت مکان
دل کا لہو بہتا ہے دیکھ
تنِ زار غم سہتا ہے دیکھ
غمگین جہاں رہتا ہے دیکھ
بندہ علیؔ کہتا ہے دیکھ
افسوس و حسرت یوسفا
تیری جدائی سے سدا

ضمیمہ نمبر2

تکمیلِ انسانیت

1

عزیز احمد شباب کی رعنائیوں کا مجسمہ۔ لمبے قد نرگسی آنکھوں بلوریں اور غزالی گردن والا عزیز احمد ابھی عمر کے اکیسویں بہار میں قدم رکھنے والا تھا کہ والد کے سایہ سے محروم ہو گیا۔

جس طرح کہ قدامت پرست رئیسوں کا شیوہ ہے کہ ہر ایک فائدہ بخش اور نفع رساں چیز سے جس کا حصول خاص کر فی زمانہ عزت اور آرام سے رہنے کے لیے ضروری ہے، ہمارے باپ دادوں نے ایسا نہیں کیا۔ ''ہماری اولاد کو ملازمت تھوڑی کرنی ہے۔ اسلاف کی روایات اور طرزِ معاشرت کے لیے انگریزی تعلیم مضر ہے، خطرناک ہے'' وغیرہ وغیرہ کہہ کر اپنی اولاد کی بربادی کا باعث بنتے ہیں۔ اسی طرح عزیز احمد کو باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے سے محروم رکھا گیا۔ البتہ احباب کے مجبور کرنے پر عزیز احمد کے والد صرف اس حد تک آمادہ ہوئے کہ عزیز احمد کے لیے ایک اردو فارسی کا معلم 80 روپیہ ماہوار مشاہرہ پر رکھا گیا۔

2

عزیز احمد فطرت سے ایک خاص قسم کا دل و دماغ لے کر آیا ہوا تھا۔ اور نہایت ہی ذہین تھا۔ جس طرح کہ رئیس زادے اکثر اَسیر و شکار کھیل و کود کے دلدادہ ہوتے ہیں، عزیز احمد کو ان باتوں سے نفرت تھی۔ اس کو بچپن سے ہی حصولِ تعلیم کا شوق نہ تھا بلکہ جنون تھا۔ چار بجے منہ اندھیرے اٹھ کر نوکر کو ساتھ لیے استاد کے ہاں جانا، اور شام منہ اندھیرے گھر واپس آنا۔ گھر میں بھی کتابیں ساتھ لے آنا۔ کھانا کھانے کے بعد چراغ سامنے رکھ کر پڑھے ہوئے سبق کو پوری طرح حفظ کر لینا۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ اس کی والدہ نے پہلی نیند کے بعد کروٹ لینے پر جو اپنے سعید بیٹے کو یوں مصروفِ کتاب دیکھا تو جذبۂ محبتِ مادری سے مغلوب ہو کر بستر سے اٹھ عزیز احمد کے گالوں پر مُہرِ محبت ثبت کرتے ہوئے کہا، ''میرے لال اب بہت وقت گزر گیا ہے۔ دیکھو اتنی تکلیف سے دماغ خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اپنی ماں کا کہنا مان، چل سو جا''۔ عزیز احمد بیچارہ والدہ کی تعمیلِ حکم میں چپ چاپ آ بستر پر لیٹ جاتا۔ بستر پر بھی کافی عرصہ تک زیرلب کچھ گنگناتا رہتا۔ شاید وہ باقی حصہ کو جسے والدہ کی خاطر ترک کرنا پڑا تھا حفظ کرتا ہوگا۔

بالآخر چار سال کی سرگرم تعلیم کے بعد جب عزیز احمد کے والد نواب محمد عثمان خان نے عزیز احمد کے معلم کو خلعت جو چار سو روپیہ نقد، ایک لنگی ریشمی اور چند دیگر ریشمی پارچات پر مشتمل تھی، دے کر رخصت کیا تو عزیز احمد اُس وقت فارسی اور اردو کی ہر ایک مشکل سے مشکل کتاب بآسانی پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔ اُسے اگر افسوس تھا، ہاں ناقابلِ تشریح افسوس، تو عدم حصولِ تعلیمِ انگریزی کا.....

3

عزیز احمد کے دو بھائی اور تھے۔ ایک تو نواب اشفاق احمد جس کی عمر تقریباً پچتالیس برس

تھی۔ اور یہ سوتیلی ماں سے تھے۔ چونکہ بڑے صاحبزادہ ہونے کی حیثیت سے والد کی مسند کے جانشین ہونے والے تھے، اس لیے چھوٹے نواب کہلاتے تھے۔ اس احساس نے کہ اب چند دنوں میں 15 ہزار رعایا کی قسمت کے مالک ہونے والے تھے، اور ساتھ مال کی کثرت خود مختارانہ حکمرانی کا نشہ اور بچپن کی تربیت کے فقدان نے نواب اشفاق احمد خان کو قدرتی طور پر ایک بے رحم اور پتھر دل انسان بنا دیا تھا۔ اپنی بہیمانہ خواہشات کی تکمیل کے لیے وہ ہر ایک ذلیل سے ذلیل ننگ انسانیت افعال کے ارتکاب سے بھی نہ جھجکتا۔

دوسرے چھوٹے بھائی جو عزیز احمد کے ''ماں جائے'' تھے، اس کا نام رشید احمد تھا۔ اور اس کی عمر 15 برس تھی۔ یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب کہ نواب محمد عثمان خان کو انتقال کیے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ نواب مرحوم چونکہ ایک نہایت ہی متمول رئیس اور اپنے شہر کے سردار تھے۔ ان کے انتقال کے بعد کچھ دن تو اعزہ داری اور آنے جانے والوں کے انتظار خدمت گزاری میں صرف ہوئے۔ اِن رسمی مظاہروں سے فراغت کے بعد نواب اشفاق احمد کی رسم گدی نشینی سنائی گئی۔ جس میں شہر کے تمام معزز روٴسا، وکیل، ڈاکٹر، مجسٹریٹ، ڈپٹی کمشنر، کمشنر شریک ہوئے۔

آخر کار وہ لمحہ بھی آ گیا جس میں کہ عزیز احمد اور اس کے چھوٹے بھائی رشید احمد کی قسمتوں کا اہم فیصلہ ہونے والا تھا۔ نواب اشفاق احمد نے خود ہی اپنے چند ہم جیسوں کی وساطت سے تقسیمِ جائیداد کے متعلق سلسلہ جنبانی شروع کی۔ عزیز احمد نے اس کا جواب یوں دیا کہ نواب اشفاق احمد صاحب میرے بزرگ بھائی اور میرے لیے پدرانہ حیثیت رکھتے تھے۔ ہم دونوں یتیم بھائی اس کو ہی اپنا باپ سمجھ کر اُس کے سایۂ عاطفت میں زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ ہم علیحدگی کے ہرگز خواہش مند نہیں۔ اگر وہ اس پر مصر ہیں تو ہم بہ حالتِ مجبوری صرف ان کی خواہش کی تکمیل میں خلل انداز ہونے کی بناء پر سب اختیارات ان کو دے دیتے ہیں۔ وہ جس طرح مناسب تصور فرما دیں، کریں۔

نواب اشفاق احمد کے لیے یہ مژدہ ہلالِ عید سے در جہا بڑھ کر سامعہ نواز تھا۔ انھوں نے جھٹ ایک مسودہ (جسے ان کے کیفیتِ باطن کی زندہ تصور کہنا مبالغہ نہ ہوگا) تیار کروایا۔ جس کے رو سے تمام جائیداد غیر منقولہ کے دو حصوں کا حقدار نواب اشفاق اور 1/3 حصہ کے حقدار دونوں بھائی

عزیز احمد اور رشید احمد ٹھہرتے تھے۔ غیر منقولہ جائیداد جو 5 لاکھ روپیہ نقد اور 3 سو گھوڑوں اور 150 اونٹوں اور دیگر مال پر مشتمل تھی، میں سے گھوڑے اونٹ اور مال مویشی تو نواب اشفاق احمد نے اپنے لیے محفوظ رکھے۔ صرف روپیہ کی تقسیم یوں کی کہ دو لاکھ عزیز احمد اور رشید احمد کے لیے، اور تین لاکھ اپنے لیے رکھ لیے۔ اور اس تقسیم کو صحیح ثابت کرنے کے لیے یہ جواز لکھا گیا کہ چونکہ نواب اشفاق احمد کو فرائضِ گدی نشینی اور انتظامیہ امورات سجھانے کے لیے زیادہ طاقت ور ہونے کی ضرورت ہے اس لیے فریقین کی رضا مندی سے یہی طے پایا۔ اس غیر قانونی، غیر شرعی اور غیر اخلاقی فیصلہ کو جانتے ہوئے بھی عزیز احمد نے اپنی شرافتِ نفسی سے مسودہ پر خود بھی دستخط کر دیے، اور رشید احمد سے بھی دستخط کروا دیے۔ فیصلہ ریاست کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں پیش کیا گیا۔ چونکہ فریقین راضی تھے، کسی قسم کا اعتراض نہ ہوا۔

4

عزیز احمد کو باپ کے ورثہ سے ملی ہوئی جائیداد باوجود غیر منصفانہ تقسیم کے اس قدر تھی کہ عزیز احمد تھوڑے عرصہ میں اپنی سخاوت اور طبعی شرافت کے وجہ سے ہر ایک کے دل میں گھر کر گیا۔ شہر کے اعلیٰ طبقات کے افراد عزیز احمد سے گفتگو کرنا، تعلقات بڑھانا اپنا فخر سمجھتے تھے۔

ہمدردی اور خدا ترسی چونکہ فطرتاً ودیعت شدہ تھی، اس لیے غریب طبقہ عزیز احمد کو اپنا محبوب لیڈر کہا کرتے تھے۔ دولت مندی، سخاوت، شرافت، بہادری، ہمدردی، خدا ترسی، خوبصورتی جو ایک عطیہ الٰہی ہے، عزیز احمد ان تمام خوبیوں کا سرمایہ دار تھا۔ وہ، چند ملکوتی صفات جو ایک انسان کو سطح انسانی سے بلند اُس اعلےٰ وارفع آسمانِ شہرت تک پہنچانے کا ذریعہ ہوتی ہیں، کا بھی مالک تھا۔

عزیز احمد ان اخلاقِ حسنہ اور اوصافِ نادرہ سے بھی کافی حد تک بہرہ مند تھا۔ حد درجہ کا ملنسار، منکسر المزاج تھا۔ حصولِ تعیش کے اسباب کی فراہمی کے باوجود تعیش کو لعنتِ الٰہی سمجھتا تھا۔ جس طرح کہ کنول کا پھول پانی میں رہ کر تر دامنی سے پاک رہتا ہے۔ اسی طرح مادی دنیا کے

اسبابِ تعیش سے اس کو کسی قسم کی دلچسپی اور وابستگی نہ تھی۔ مطالعہ کے بے حد شغف سے احباب بھی اکثر اُشکوہ طراز رہتے۔ متعدد رسالہ جات اور اخبارات کے مستقل خریدار تھے۔ علامہ سر اقبال اور مولانا الطاف حسین حالی کی تصنیفات کے مطالعہ سے اُس نے ایسے عقائد کو اُن کے سانچے میں ڈال دیا تھا۔ قوم کی موجودہ بے کسی اور بے حسی نے اس کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا۔ وہ اکثر اُذیل کے اشعار گنگناتا رہتا۔

عمریست کہ آوازہِ منصور کہن شد
من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

بے خطرہ کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے، تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

پھر مایوسی کے لہجہ میں کہتے؛

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

پھول بے پروا ہیں، تُو گرمِ نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے، آوازِ درا ہو یا نہ ہو

5

دسمبر کا شروع ہے۔ اخباری دنیا میں ہلچل مچی ہوتی ہے۔ ''انڈین نیشنل کانگرس کا 44واں اجلاس لاہور میں منعقد ہوگا'' کے عنوان موٹی قلم سے چھاپے جاتے ہیں۔ ہر ایک حریت کا شیدائی ہمہ تن انتظار اور شمولیت کے لیے تیار ہے۔ بھلا یہ وقت عزیز احمد کے لیے گھر بیٹھنے کا کہاں۔ ملوکیت پرست احباب کے نشیب و فراز سمجھانے کے باوجود 24 دسمبر کو لاہور روانہ چل پڑے۔ کانگرس کے کُھلے اجلاس میں گئے۔ لیڈروں کی تقاریر سنیں۔ قربانی و ایثار کا مادہ قدرت سے پہلے ہی ودیعت تھا۔ اس اجتماعِ عظیم اور نعرہ ہائے ملوکیت شکن نے جلتی پر تیل چھڑکا۔ دوسرے دن ایک مقامی اخبار میں عزیز احمد کے نام سے ایک آرٹیکل شائع ہوا۔ جس میں قوم کو ہدایت تھی کہ نعرہِ اللہ اکبر سے استعمار پسندی کی زنجیریں جھٹک کر پھینک دو، اور میدانِ جہاد میں سربکف ہو کر نکلو۔ اور باقی حصہ مرزا آفتاب احمد چیف کمشنر ریاست جبل پور کے فرعونی مظالم کے خلاف تھا۔ جس کو عزیز احمد کا حساس دل نہایت بری طرح محسوس کر رہا تھا۔ مرزا آفتاب احمد چیف کمشنر ریاست جبل پور 18 سال سے اس عہدے پر مامور ہیں۔ ان کے عقیدہ میں اگر کوئی چیز قابلِ اعتبار ہے تو زور اور چالبازی۔ اس کی دنیا جبر و تشدد اور مکر (ایک لفظ پڑھ نہیں جا رہا: ایڈیٹر) تک محدود تھی۔ کسی چیز کے ارادہ کر لینے پر اس کے حصول کے لیے ہر ایک مذموم حرکت عمل میں لانی کوئی بڑی بات نہ تھی۔ کسی بیوہ کی فریاد، کسی یتیم کی زاری اُن کو اپنے فیصلہ سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔

الغرض وہ ایک ایسی طاغوتی قوت کے اوتار تھے جس کی مثال دنیا کو پیدا کرنا تقریباً دشوار

ہے ۔ چونکہ گورنمنٹ برطانیہ کے بڑے خیر خواہ تھے، اور ریاست کی تمام پیداوار اُن کی خوشنودیِ مزاج پر صرف کی جاتی تھی اس لیے پبلک کی چیخ و پُکار واویلا کے باوجود وہ زیادہ مضبوط پوزیشن حاصل کرتے گئے ۔تعلیم صرف پرائمری تک محدود تھی ۔مگر مشہور ہے کہ روپیہ قاضی الحاجات ہے، اس لیے تمام برٹش پولیٹیکل آفیسر اُن کے اس عیب کو نظر انداز کیے جاتے تھے۔

6

بالآخر 3 جنوری کا وہ منحوس یا سعید دن بھی آ پہنچا۔ جب اس ناز و نعم کے پروردہ نوجوان کو پولیٹیکل ایجنٹ ریاست جبل پور نے طلب کیا۔ اور وہ آرٹیکل عزیز احمد کو پڑھ کر سنایا گیا۔ عزیز احمد نے کہا کہ انگریز پولیٹیکل ایجنٹ ایک ثالث کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کا فرض ضرورت پڑنے پر ریاست کے راعی اور رعایا کے درمیان انصاف کو قائم رکھنا ہے۔ چونکہ مجھے کامل احساس ہے کہ آپ مرزا آفتاب احمد چیف کمشنر ریاست کے زیر اثر اپنی حقیقی پوزیشن قائم نہیں رکھ سکتے۔ اس لیے میں خاموش ہوں۔

تین مہینہ کی پیشی پڑی۔ عزیز احمد کو پولیٹیکل ایجنٹ نے مرزا آفتاب احمد کے حوالہ کر دیا کہ وہ اپنے عزم کو ریاست کے جیل میں تا تاریخ پیشی رکھے۔

عزیز احمد کو جیل میں کسی قسم کے اخبار یا رسالجات یا مطالعہ کے لیے دوسری کتب نہیں ملتی تھیں۔ مرزا آفتاب احمد کے ہدایت کے بموجب عزیز احمد کو ہر قسم کی روحانی تکالیف دی گئیں۔ اس تین ماہ کے عرصہ میں مرزا آفتاب احمد کی ریشہ دوانیاں پایۂ تکمیل تک پہنچ چکی تھی۔ تاریخ پیشی پر پولیٹیکل ایجنٹ نے آٹھ ہزار روپیہ جرمانہ اور ڈیڑھ سال سزائے قید کا فیصلہ سنا دیا۔ آٹھ ہزار تو عزیز احمد کی جامہ تلاشی سے بوقت گرفتاری برآمد ہوا، داخلِ جرمانہ کر دیا گیا۔ اور عزیز احمد کو جیل بھیج دیا گیا۔ بس اب اس کا واحد مشغلہ جیل میں نماز اور تلاوت قرآن شریف تھا جو کہ پانچ ترجموں والا تھا۔ اور حاشیہ پر تفسیر بھی تھی۔ وہ قرآن شریف کے معنی نہایت ہی غور و انہماک سے ذہن نشین کرتا۔ اور اُس وقت تک کہ کسی آیت کے معنی اور شانِ نزول کے متعلق اس کو پوری تسلی نہ ہوتی، آگے نہ

بڑھتا تھا۔ وہ نماز کے اصلی مقصد تک پہنچنے کی کوشش میں رہتا جو مقصد خداوند پاک کو نماز سے مقصود تھا۔ قرآن پاک کی رسمی تلاوت اُس کے عقیدہ میں بے معنی اور جہل تھا۔ وہ قرآن حکیم کو صحیفۂ فطرت کا جامع خلاصہ اور خدا کا آخری فرمان ایک خالق حکیم و علیم کا اپنی مخلوق کی طرف اس کے لیے دنیا میں خوش اسلوبی۔۔۔۔ (فقرہ نامکمل ہے: ایڈیٹر)۔ اس کے علاوہ رات کو بعد نمازِ عشا دو گھنٹہ اللہ سے خالی الذہن ہو کر یادِ حق میں گزارنا اُس کا معمول تھا۔ جیل میں گیارہ مہینہ کے درمیان آخر، اُس نے اپنی صادقانہ ان تھک کوششوں سے گوہرِ صداقت کو پالیا۔ فلسفۂ اسلام اور حق و باطل کی جنگ کے اسباب اس کے فہم میں آ گئے ۔ اب وہ ایک نڈر توحید پرست تھا۔ باطل کی بہیمانہ باطل آراؤں نے اس کو ''حق'' سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ براہیمی عشق اور قربانی کا جذبہ چاہتا تھا، اس کو وہ حاصل ہو گیا۔ وہ حسین علیہ السلام کی سی تڑپ اور شہادت کی زبردست تمنا مانگتا تھا، اس کو مل گئی۔ وہ اپنی کوٹھڑی میں 1 بجے سے 3 بجے مجنونانہ اٹھ کر یہی کہتا سنائی دیا کرتا تھا۔

تیر و سنان و خنجر و شمشیر م آرزوست
بامن میا کہ مسلکِ شبیرم آرزوست

پھر کہتا؛

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

پھر کہتا؛

آں قدر زخمے کہ دل میخواست در پیکاں نہ بود*

الغرض اس عرصہ میں انوارِ الٰہی کی فیاضانہ بارش نے اس کو اپنی اصلیت سے باخبر کر دیا تھا۔ اس کے چہرہ سے الوہیت برستی تھی۔ وہ عزیز احمد جو کبھی اعلیٰ قسم کے کشمیرہ کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ اب ایک سفید لٹھ کی شلوار، کھلے گلے کی خاکی قمیض اس کے اوپر سفید لٹھ کی چادر اُس کا لباس تھا۔

*پورا شعر یوں ہے:

خویش را بر نوکِ مژگانِ ستم کیشاں زدم
آں قدر زخمے کہ دل میخواست در خنجرنہ بود

(سردی ہو یا گرمی وہ اس لباس میں رہتا۔ سر برہنہ رہنے سے وہ خوش رہتا۔
الغرض وہ سادگی کا ایک مکمل مجسمہ ہو گیا۔)

(ایڈیٹر)

7

عزیز احمد کے جیل جانے کی وجہ سے رشید احمد اب تنہا بے یار و مددگار رہ گیا۔ اُدھر سے نواب اشفاق احمد جس کا ضمیر احساسِ محبت اور جذبۂ ہمدردی سے قطعاً بیگانہ تھا۔ مزید بران عزیز احمد کی روز افزوں قابلیت اور ہر دلعزیزی نے اس کو رقیبانہ جذبات کی پرورش پر مجبور کر دیا تھا۔ عرصہ سے ایسے موقع کے انتظار میں تھا۔ اب عزیز احمد کی اسیری اور رشید احمد کی خوردسالی و ناتجربہ کاری سے اُس نے نہایت ہی سرعت سے فائدہ اٹھانے اور اپنی خودغرضانہ خواہشات کے تکمیل کی ٹھانی۔ اور افسرانِ مقامی کے کان بھرنے شروع کیے۔ عزیز احمد کو ایک مادرزاد انقلاب پسند اور دشمنِ حکومت ثابت کرنے کی کوششیں شروع کیں۔ مرزا آفتاب احمد چیف کمشنر ریاست جبل پور نام کو تو صرف چیف کمشنر تھا، مگر اصلیت میں تو والئ ریاست بھی وہ تھا، اور مجسٹریٹ بھی۔ پولٹیکل ایجنٹ اُس کے اشارہ پر ناچتے تھے۔ ان کی سخت گیری کی وجہ سے اب تک ریاست میں کسی قسم کی تحریک نے جنم نہ لیا تھا۔ پبلک جلسہ تو کجا، دس بیس کی مجلس میں بھی اگر کوئی ملکی اصلاحات اور موجودہ نقائص کا ذکر غلطی سے کر بیٹھتا تو بے مقدمہ چلائے سالوں تک جیل کی چکی پیستا۔ ویسے تو ریاستیں اکثراً قانون و انصاف سے مستثنیٰ سمجھتی جاتی ہیں۔ مگر جس قسم سے قانون و انصاف کا خون اس ریاست میں بالخصوص مرزا آفتاب احمد کی حکومت میں ہوتا رہتا ہے، اس کی مثال تمام دنیا کے کسی گوشہ میں نہ ملے گی۔ عوام کو تعلیم سے دانستہ بے خبر رکھا گیا۔ تمام ریاست میں تلاش کرنے پر چند گنتی کے پرائمری

پاس ملیں گے اس لیے اس ریاست میں مارشل لا جاری تھا۔

چونکہ مرزا صاحب تو عزیز احمد کو زیادہ سے زیادہ تکلیف دیکھنے میں متمنی تھے۔ ان کو عزیز احمد سے ایک ذاتی اور ناقابلِ معافی کدورت پیدا ہو چکی تھی۔ ان کی دلی حالت یہ تھی کہ عزیز احمد پر سخت سے سخت تر تکالیف ڈالی جائیں اور وہ روئے گڑگڑائے، ان سے معافی مانگے۔ عزیز احمد نے سزا سے قبل بالواسطہ یا بلاواسطہ تحریری یا زبانی معافی مانگی بھی ہوتی مگر اب تو وصولِ صداقت کے بعد وہ ماسوااللہ کے کسی کے سامنے ناجائز طور پر جھکنا شرک اور کفر سمجھتا تھا۔ مرزا آفتاب احمد نے نواب اشفاق احمد کی آڑ میں یا نواب اشفاق نے مرزا آفتاب احمد کی مدد سے بہرحال جو سمجھ لو، ایسا جال تیار کیا کہ نواب اشفاق کی ایک درخواست پر عزیز احمد اور رشید احمد کی جاگیر جو اُن کو حصہ میں دی گئی تھی، تاحکمِ ثانی کورٹ آف وارڈز میں داخل کی گئی۔ رشید احمد ناتجربہ کاری کی وجہ سے کچھ نہ کر سکتا تھا۔ اور کرتا بھی کیا جب کہ پولٹیکل ایجنٹ سے ریذیڈنٹ تک آفتاب احمد کے زیر اثر تھے۔ ان پے در پے مصیبتوں کے نزول سے بے چارہ رشید احمد جس نے کبھی غم کی شکل تک نہ دیکھی تھی، کس حالت میں ہوگا، اس کا اندازہ وہ دل کر سکتا ہے جس پر کبھی ایسی گزری ہو۔ بھلا بیس تیس افراد پر مشتمل کنبہ اور امیرانہ حیثیت سے رہنے کے عادی اب کیسے گزارہ کرتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ دنوں سے گزر کر ہفتوں تک فاقہ پر نوبت پہنچی۔ عزیز احمد پابندی کی حالت میں اپنے پسماندگان کی یہ حالت سن کر خاموش ہو جاتا۔ اور کبھی اُس کی زبان سے حرفِ شکایت نہیں نکلا۔ ہر الم انگیز سانحہ کی خبر پر **الحمد للہ علی کل حال** کہہ کر خاموش ہو جاتا۔

8

عزیز احمد کو تقریباً ایک سال اس حالت میں ہو گیا ہے۔ دو بجے رات کا عمل ہے۔ عزیز احمد کی کوٹھڑی میں ایک ہریکین لیمپ جس کی روشنی نہایت مدھم ہے، جل رہی ہے۔ عزیز احمد ایک دری پر چادر اوڑھے دوزانو بیٹھا ہوا ہے۔ اس وقت وہ ماحول کے اثرات سے بے خبر کسی خاص شغف میں آنکھیں بند گردن نیچے کیے ہوئے بیٹھا ہے۔ اچانک بلند آواز سے السلام علیکم کی روح

پرورصداسکوت کو چیرتی ہوئی اُس کے کانوں میں پہنچی۔ گردن اوپر ہوئی۔ آنکھیں نیم وا تھیں۔ اپنے سامنے دونورانی مجسمے انسانی شکل میں کھڑے تھے۔ کوٹھڑی کا دروازہ بدستور مقفل پا کر عزیز احمد حیران سارہ گیا۔ مسرت واستعجاب کے مشترکہ جذبات کے زیر اثر چند ساعتوں تک خاموش رہنے کے بعد وعلیکم اسلام رحمتہ اللہ وبرکاتہ کہا اور گویا ہوا، ''کیا میں اپنے معزز مہمانوں کی تعریف اور مقصدِ تشریف آوری سے آگاہ ہوسکتا ہوں؟'' یہ کہتے ہوئے عزیز احمد نے کچھ ہٹ کر اُن مہمانوں کو وہاں بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا۔ وہ دونامعلوم مہمان وہاں بیٹھ گئے۔ عزیز احمد بھی ان کے نزدیک بیٹھ گیا۔

اُن دو میں سے ایک شاید عہدہ میں اس سے اعلیٰ ہوگا، نے کہنا شروع کیا، ''ہم دونوں فرشتہِ انصاف ہیں۔ کائناتِ ارضی میں انصاف قائم رکھنے کے لیے بارگاہِ ایزدی سے مامور ہیں۔ مرزا آفتاب احمد چیف کمشنر اور نواب اشفاق احمد کی چیرہ دستیاں، آپ کی مظلومیت اور صابریت اپنے انتہائی معراج کی کمال پر پہنچ چکی ہیں۔ اس ایک سال میں آپ نے حقِ بندگی کو خوب نبھایا۔ ہم آپ کو بارگاہ ایزدی سے ''صابر'' کا خطاب عطا ہونے کا مژدہ سنانے اور آپ کی تکالیف کا خاتمہ کر کے انصاف پہنچانے اور مرزا آفتاب احمد اور نواب اشفاق احمد کو اُن کے کیفرِ کردار کے انجام پر پہنچانے آئے ہیں۔ عنداللہ تو اُن کا شمار ظالموں میں کبھی سے قرار دیا گیا ہے۔ مگر اب عندالناس کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کر کے ان کی فرعونیت کا حشر ان کو یہاں بھی بھگتانا ہے''۔ پھر چند لمحہ ساکت رہ کر، ''آپ خاموش اور مضمحل کیوں ہوگئے۔ اب تو آمد بہار ہے۔ آپ کی تکالیف ومصائب کا آج سے خاتمہ ہوگیا۔ آپ کے معاندین کو آپ کے حسبِ منشا سنگین سزائیں دی جائیں گی۔ مگر آپ تو برعکس اس کے زیادہ اُداس ہوتے جاتے ہیں۔'' فرشتہ نے کہا۔

''اے انصاف کے فرشتو! میں تابع نہیں کہ میری متاع زندگی جو میرا ایک فطری (لفظ کٹا ہوا ہے: ایڈیٹر) کے عیوض کسی چیز کے عطا ہونے کا مژدہ مجھے مسرور کرسکتا ہے۔ میری بندگی جزا کے لالچ سے بے پرواہ ہے۔ مرزا آفتاب احمد بنی آدم کی حیثیت سے میرے بھائی ہیں۔ مجھے اُن سے کسی قسم کی کدورت رنجش نہیں۔ واللہ باللہ میں اس کی بربادی کا خواہاں نہیں۔ میں اس کو

عقوبت کے شکنجہ میں گرفتار دیکھنا نہیں چاہتا۔ بلکہ میں اس کی ہدایت کا منتظر ہوں۔ خدارا جاؤ، جلدی جاؤ۔ آپ کو خدائے واحد کی عظمت کا واسطہ ہے۔ جاؤ درگاہِ ایزدی سے اُس حکم کو اِن لفظوں میں تبدیل کرواؤ کہ مرزا آفتاب احمد کی بے نور آنکھوں کو نورِ ہدایت کا سرمہ لگایا جاوے۔ اُس کے مُردہ ضمیر کی صدائے اللہ اکبر سے مسیحائی کی جاوے۔ اس کے مفلوج قدم کو صراطِ مستقیم کی شاہی سڑک پر راجع کیا جاوے۔ ''نبی آدم اعضائے یک دیگرند'' کے معنی اس کو ذہن نشین کرائے جاویں۔ بس یہی میرا انتہائے زندگی ہے، یہی میری تمنا ہے۔ اور یہی میری زندگی کا اجر ہے۔ اور یہی میرے لیے میرے مولائے پاک کی خوشنودی کا تمغہ ہے۔ مرزا آفتاب احمد کی سزا یا فنگی میرے لیے ''میری جزائے بندگی کی فوتیدگی اور میری رفتارِ بندگی میں مخل ہونے کے مترادف ہے۔ اس کی ہدایت میری تن آسانی اور سُست گامی کے لیے ایک تازیانہ ثابت ہوگی''۔

یکا یک عزیز احمد خاموش ہوگیا۔ اس کی آواز گلوگیر ہوگئی تھی۔ اس کی دونوں آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو اُس کے رُخسار کو وضو کروا رہے تھے۔ اچانک مجنونانہ حالت میں وہ اُٹھ تن کر کھڑا ہوگیا۔ فرشتوں کی طرف مخاطب ہوکر کہنے لگا، ''اٹھو اے فرشتو! مالک کی بارگاہ میں ہم آہنگ ہوکر عرض کریں''۔ اس وقت عزیز احمد کی حالت ایسی رُعب انگیز ہورہی تھی کہ فرشتوں کو تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ عزیز احمد کے دونوں ہاتھ اوپر سر تک گئے۔

''اے میرے خالقِ ارض وسما! اے قسامِ ازل! اے رحیموں کے رحیم! اے دنیا کے آقا کہلانے والے بندوں کے آقا! مرزا آفتاب احمد پر رحم کر۔ سزا دینے کے بجائے اُسے ہدایت عطا فرما۔ اس کے ساتھ میری رنجش سوائے اس ایک امر کے کچھ اور نہیں کہ وہ اپنی بے بصری سے تیرے بنائے ہوئے احکام پر چلنے سے گریز کرتا ہے۔ پھر تُو کیوں نہ اُس کو ہدایت سے منور کرتا ہے۔ میرے مولا! تُو منصفِ حقیقی ہے مگر تیرے انصاف پر تیرے رحم کو تقویت ہے۔ پھر کیوں بیچارہ آفتاب احمد تیرے رحم سے محروم رہے۔ اسی طرح بے چارہ نواب اشفاق احمد میرے بزرگ بھائی وہ بھی چاہِ ضلالت میں غلطاں ہے۔ آپ کے دریائے رحمت کی ایک موج اُن کے راہِ راست پر لانے کو کافی ہے۔ مولا رحم کر۔ جب تک کہ رحمت کی سطح میں امواج حرکت میں نہ آئیں گے، میں

الحاح وزاری کا چپو چلاتا جاؤں گا‘‘۔

یہاں آ کر عزیز احمد کی ہچکی بندھ گئی۔ آنسوؤں کا ایک سیلاب تھا کہ دو چھوٹے چشموں سے اُمڈتا ہوا نکل رہا تھا۔ ایک دولحہ میں عزیز احمد بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑا۔

دونوں فرشتوں نے عزیز احمد کے بے ہوش جسم کو اٹھا کر تعظیم و تکریم سے فرش پر لٹا دیا اور خود غائب ہو گئے۔

9

فضا میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی ہے۔ فرشتوں میں ایک ایسی خوشی کا سماں بندھا ہوا ہے جیسے کہ آج اُن کا کوئی سالانہ جشن ہے۔ ہر ایک مقام پر 20-20، 40-40 فرشتوں کا مجمع ہے۔ اور ہر ایک کی زبان پر یہی گیت جاری ہے۔

مکمل ہو گئی انسان پہ تعلیمِ قرآنی
ہوئی ہے آج کی شب جیل میں تکمیلِ انسانی

اسی شب پچھلے آسمان پر جلی حروف میں لکھا ہوا پایا گیا:

تکمیلِ انسانیت!